قولِ فیصل

ابوالکلام آزادؒ

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۴۹۱، کوتانہ اسٹریٹ، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جھلک

مولانا کی گرفتاری اور اس کی نوعیت
مقدمہ کی چند خصوصیات
پیغام
گرفتاری
پہلی پیشی
دوسری پیشی
تیسری پیشی
نقل استغاثہ
چوتھی پیشی
پانچویں پیشی
چھٹی پیشی
ساتویں پیشی
مولانا کا تحریری بیان
آخری پیشی
فیصلہ

بار اوّل	فروری ۱۹۸۷ء
نام کتاب	قول فیصل
مؤلف	مولانا ابوالکلام آزاد
ناشر	اعتقاد حسین صدیقی
مطبع	
قیمت	۱۵/ روپے

۵

یہ ہے پہچان خاصانِ خُدا کی ہر زمانے میں

کہ خُوش ہو کر خُدا ان کو گرفتارِ بلا کردے

اسلام کسی حال میں جائز نہیں رکھتا
کہ مسلمان آزادی کھو کر زندگی بسر کریں
مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا آزاد
رہنا چاہیئے تیسری راہ اسلام میں
کوئی نہیں ؛

مسٹر مجسٹریٹ! یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے۔ تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو، کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو بیان عدالت میں دیا۔ اس کی نقل میرے پاس پہنچی۔ مولانا کے بیان میں بہت بڑی ادبی خوب صورتی ہے۔ وہ نہایت وسیع روانی کے ساتھ پُرجوش بھی ہے۔ وہ نہایت دلیرانہ ہے۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل اور غیر آشتی طلب ہے۔ UNCOMPROMISING ہے۔ مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی ہے۔ تمام بیان میں اوّل سے آخر تک ایک پُرجوش اثر پایا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا خلافت اور نیشنلزم پر مولانا ایک پُراثر خطبہ دے رہے ہیں۔

مولانا کا بیان پڑھ کر جب میں فارغ ہوا، تو ایک بات بہت زیادہ واضح ہو کر میرے سامنے آ گئی۔ یعنی عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے کی اصلی ضرورت کیا ہے۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ بے خوفی اور مضبوطی ہم میں کہاں ہوتی جو آج ہمارے اندر کام کر رہی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر ہم نے عدالتوں کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا۔ تو ہم کو آج مولانا کے بیان جیسی گراں قدر چیز نہ ملتی، جو بجائے خود ایک بہترین سیاسی تعلیم ہے۔

عدالتوں کے بائیکاٹ کا اثر صرف اسی چیز میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کہ کتنے قانون پیشہ اصحاب نے پریکٹس چھوڑ دی؟ اصلی چیز دیکھنے کی یہ ہے

مولانا کی گرفتاری اور اُس کی نوعیّت

ملک کے مُسلّمہ لیڈروں میں سب سے آخری گرفتاری مولانا اور مسٹر سی آر داس کی ہوئی۔ مسٹر داس کی گرفتاری بنگال کے مقامی حالات کا نتیجہ تھی لیکن مولانا کا معاملہ اُن سے بالکل مختلف تھا۔ اگر ۱۸ نومبر کے بعد کے حالات پیش نہ آتے، جب بھی ان کی گرفتاری اٹل تھی اور ہر صبح و شام متوقع تھی گزشتہ ایک سال کے اندر شاید ہی کسی نے اس قدر صاف صاف اور بے پردہ چیلنج گورنمنٹ کو دیا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا نے دیا۔ مسئلہ خلافت اور سوراج سے قطع نظر خاص طور پر بھی وہ برابر گورنمنٹ کو اپنی گرفتاری کے لیے دعوت دیتے رہے۔ اور ان کا طرزِ عمل ہمیشہ (UNCOMPROMISING) رہا

مارچ ۱۹۲۱ء میں مہاتما گاندھی کے ہمراہ مولانا نے دورہ کیا۔ اس وقت ضلع لاہور اور امرت سر میں سڈیشن میٹنگس ایکٹ نافذ تھا۔ یعنی نہ تو کوئی پبلک جلسہ ہو سکتا تھا، نہ کوئی پبلک تقریر کی جا سکتی تھی۔ اسی لیے مہاتما جی نے بھی گوجراں والہ جا کر تقریر کی۔ لاہور اور امرت سر میں کوئی تقریر نہیں کی۔ کیوں کہ

کہ آج سے دو سال پہلے جو ہماہمی اور رونق عدالت گاہوں کے اندر باہر نظر آتی تھی وہ کس طرح اب مفقود ہو گئی ہے اور وہ صرف لین دین کرنے والوں اور تمار بازوں کی ایک کمین گاہیں ہیں۔ نہ وہ قومی آزادی کا سرچشمہ ہیں، نہ انفرادی آزادی کا۔ اس بات کا اندازہ کہ قوم کیسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے؛ صرف بہادر اور بے خوف دلوں کے جذبات دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

مولانا کے بیان کا رُوئے سخن اگرچہ عدالت کی طرف ہے لیکن دراصل وہ ملک و ملّت سے خطاب کر رہے ہیں۔ فی الحقیقت ان کا بیان ایسا ہے گویا عمر بھر کے لیے سخت سخت سزاؤں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

ایک سال قید بامشقّت سزا کا فیصلہ سن کر مولانا نے خوب کہا:۔

"میں جس سزا کا متوقع تھا، اس سے تو یہ بہت ہی کم ہے۔"

(مہاتما گاندھی)
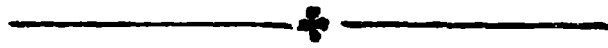
ایک ہفتہ کے بعد وہ امرت سر آئے۔ یہاں بھی تقریر ممنوع تھی لیکن جامع مسجد میں انہوں نے خطبہ دیا اور نماز کے بعد مختصر تقریر کی۔ اسی وقت وہ میل ٹرین سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ اس لیے دس پندرہ منٹ سے زائد نہ بول سکے تاہم اُنہوں نے صرف اس لیے تقریر کی تھی۔ کہ گورنمنٹ پنجاب کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ جمعہ کا خطبہ معمولی تقریر نہیں ہے، جس کے ارتکاب سے سرکاری آرڈر کی خلاف ورزی ہوئی ہو۔ بس عام بول چال کے مطابق جس تقریر کو پولیٹیکل تقریر کہہ سکتے ہیں، وہ بھی انہوں نے نماز کے بعد کر دی اور گورنمنٹ کے لیے کسی حیلے حوالے کی گنجائش باقی نہ چھوڑی۔ مگر گورنمنٹ پنجاب نے بالکل تغافل کیا۔ گرفتار کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مولانا نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا تھا۔

اس کے بعد کراچی خلافت کانفرنس کے ریزولیوشن کی بنا پر علی برادرز اور دیگر اصحاب کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اس موقع پر تو مولانا نے اپنی گرفتاری کے لیے یکے بعد دیگرے ایسے شجاعانہ بلاوے دیے کہ شاید ہی کوئی نظیر اس کی مل سکے۔ علی برادران ۱۴ اگست کو گرفتار کیے گئے۔ لیکن کلکتہ ۱۸ کی صبح کو خبر پہنچی انہوں نے اسی وقت ہالیڈے پارک میں جلسہ کے انعقاد کا اشتہار دیا اور شام کو بیس ہزار سے زائد کے مجمع میں تقریر کی۔ انہوں نے کہا تھا:۔

جس ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران گرفتار کیے گئے ہیں۔ وہ اسلام کا ایک دانا ہوا اور مشہور و معروف مسئلہ ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن دراصل میرا ہی تیار کیا ہوا

اس وقت تک قانونی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ اگرچہ اس وقت قانون کی خلاف ورزی کرنے کا عام طور پر حکم نہیں دیا گیا ہے لیکن میرے لیے افضلیت (عزیمت) اسی میں ہے۔ کہ خلاف ورزی کروں اور سچائی کے اعلان سے باز نہ رہوں۔ جب میں افضل بات پر عمل کر سکتا ہوں تو کم مرتبہ طریقہ کے دامن میں کیوں پناہ لوں؟ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا۔ کہ جمعہ کے دن شاہی مسجد میں بیان کریں گے۔ بعض وزراءِ حکومتِ پنجاب نے مہاتماجی سے شکایت کی۔ کہ مولانا کا طرزِ عمل آپ کے خلاف ہے لیکن مہاتماجی نے کہا: بلاشبہ میں عام طور پر سول ڈس اوبیڈینس کی اجازت کا مخالف ہوں۔ لیکن ایسے ذمہ دار افراد کے لیے جیسے کہ مولانا؟ ہر وقت اس کا دروازہ کھلا ہے، چنانچہ جمعہ کے دن انہوں نے پہلے جمعہ کا خطبہ دیا۔ اس کا موضوع بھی وقت کے مسائل ہی تھا۔ پھر نماز کے بعد صحنِ مسجد میں ترکِ موالات پر ایسی دل ہلا دینے والی تقریر کی جو ہمیشہ اہلِ لاہور کو یاد رہے گی۔ لاہور کے نیم سرکاری اینگلو انڈین آرگن "سول اینڈ ملٹری" نے اس پر لکھا تھا۔ کہ اس کارروائی کے ذریعہ اعلانیہ اہلِ پنجاب کو قانون شکنی کی دعوت دی گئی ہے۔ مسٹر گاندھی اپنے رفیق کو اس سے باز رکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اگر گورنمنٹ پنجاب نے اس پر فوری کارروائی نہیں کی تو پنجاب کے نان کوآپریٹرز کی جرأتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ یہ بھی لکھا تھا۔ کہ مارشل لاء کے حکّام نے مسجد کو اس مجبوری سے بند کر دیا تھا۔ کہ اب سول حکّام کو بھی اس پر غور کرنا چاہیئے۔ اس نوٹ کی سرخی "صحنِ مسجد میں باغیانہ لیکچر" تھا۔

علی برادرز کی گرفتاری کے بعد مہاتما گاندھی نے ہندوستانی لیڈروں کو بمبئی میں جمع کر کے ایک مینوفسٹو شائع کیا تھا۔ اس میں کراچی رزولیوشن کی اس بنا پر تائید کی تھی کہ موجودہ حالت میں سرکار کی سول اور فوجی ملازمت کو ملکی غیرت کے خلاف کہنا کوئی جرم نہیں ہے اور ایسا کہنا ایک جائز فعل ہے۔ اس پر اخبار ٹائمز آف انڈیا نے لکھا تھا کہ گورنمنٹ اس مینوفسٹو پر دستخط کرنے والوں کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کرے گی کیونکہ صرف اس خیال کو زبان سے ظاہر کر دینا کوئی جرم نہیں ہے بلکہ عملاً سپاہیوں کو ورغلانا اور ان کو ترکِ ملازمت کی دعوت دینا جرم اور سازش ہے۔ کراچی کا مقدمہ عملی اقدام کی بنا پر کیا گیا ہے محض رزولیوشن پاس کر دینے کی بنا پر نہیں ہے۔

یہ بات بہت سے کمزور دلوں کے لیے ایک حیلہ بن گئی۔ وہ کراچی رزولیوشن کا اعلان کرتے مگر "ایسا کروں گا" اور "ایسا ہونا چاہیئے" وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ بولتے، بالفعل عمل کرنے پر زور نہ دیتے، نہ اپنے عمل کرنے کا اظہار کرتے لیکن مولانا نے یہ تسمہ بھی لگا نہ رکھا۔ انہوں نے بمبئی، آگرہ، لاہور وغیرہ کی تقریروں اور اپنے تحریری اعلانات میں صاف صاف کہہ دیا کہ یہ میرا اعتقاد یا زبانی اعلان ہی نہیں ہے اور نہ لیڈروں کے مینوفسٹو کی طرح صرف اس بات کے جواز کا مدعی ہوں بلکہ دو سال سے اس پر عمل بھی کر رہا ہوں۔ آئندہ بھی کروں گا اور ہر شخص سے کہتا ہوں کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ میں پوری جد و جہد کروں گا کہ ہر سپاہی تک اس پیغامِ حق کو پہنچا دوں۔

ابتدا میں گورنمنٹ نے علی برادران اور ان کے ساتھیوں کے برخلاف صرف

ہے اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے اسی
کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور ہُوا ہے۔ میں اس سے
بھی زیادہ تفصیل اور صفائی کے ساتھ اس وقت اس
کے مضمون کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی آئی ڈی کے
رپورٹر بیٹھے ہیں اور میں انہیں کہتا ہوں کہ حرف بحرف
قلم بند کر لیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا
چاہیئے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔"

اس کے بعد دہلی میں مرکزی جمعیتہ العلماء اور خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ ان دونوں جلسوں میں بھی انہوں نے کراچی رزولیوشن کو زیادہ صاف اور واضح لفظوں میں پیش کیا۔ نیز ایک تجویز اس مضمون کی بھی پیش کی کہ "چونکہ گورنمنٹ نے اس اسلامی حکم کی تبلیغ کو جرم قرار دیا ہے، اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اب اس کے اعلان میں اپنی جان لڑا دے اور ہر مقام پر اس غرض کے لیے جلسے منعقد کیے جائیں۔"

چنانچہ تمام ملک میں جلسوں کے انعقاد اور کراچی رزولیوشن کی تصدیق کا سلسلہ شروع ہو گیا اور گورنمنٹ حیران و درماندہ ہو کر رہ گئی۔

پھر کراچی، بمبئی، آگرہ اور لاہور وغیرہ میں بھی وہ برابر اس کا اعلان کرتے رہے۔ بمبئی، آگرہ اور لاہور کی کانفرنسوں کے صدر بھی وہ ہی تھے۔ آگرہ کی پراونشل خلافت کانفرنس میں کراچی رزولیوشن پیش کرتے ہوئے انہوں نے جس طرح گورنمنٹ کو چیلنج دیا، اسے سن کر بڑے بڑے باہمت اشخاص بھی دم بخود ہو گئے تھے اور فیصلہ کر دیا تھا کہ صبح سے پہلے ہی وہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔

کراچی، بمبئی وغیرہ میں بھی میں نے ایسا ہی بیان کیا ہے
میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ یہ صرف میرا زبانی اظہار
ہی نہ تھا۔ بلکہ میں نے اس پر عمل بھی کیا ہے اور ہمیشہ
لوگوں کو کہتا رہا ہوں کہ اس کی تبلیغ کرتے رہیں۔ اگر یہ
"سازش" اور "اغوا" ہے تو مجھے اس کے ارتکاب کا
ہزار مرتبہ اقرار ہے۔ گورنمنٹ کو چاہیئے تھا کہ علی برادرز
سے پہلے (جنہوں نے صرف نقل و اعادہ کیا ہے)
مجھ پر مقدمہ چلاتی۔

۳۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو بیان ملک کے تمام انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہو گیا مگر گورنمنٹ کی جانب سے بالکل اغماض کیا گیا اور کوئی کارروائی ان کے برخلاف نہ کی گئی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ تمام ملک کو اس پر سخت تعجب اور حیرانی ہوئی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے "بیان" کی دفعہ ۲ میں اشارہ کیا ہے۔

یہ واقعہ علاوہ ان بے شمار تقریروں اور کارروائیوں کے ہے، جن میں وہ برابر بلا کسی تنزل کے یکساں قول و فعل کے ساتھ مشغول رہے۔

پس ان حالات میں اگر اس قدر توقف اور پس و پیش کے بعد گورنمنٹ نے انہیں گرفتار کیا، تو جیسا کہ انہوں نے کہا ہے۔ فی الحقیقت یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے اور ان کی طرح ہمیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔

آخری دفاعی معرکہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی حکمت ان کی گرفتاری سے بروقت ایک خاص کام لینا چاہتی تھی۔ اس لیے

کراچی رزولیوشن کا الزام لگایا تھا لیکن جب مولانا نے بار بار اعلان کیا کہ کراچی رزولیوشن خلافت اور جمعیۃ العلماء کی گزشتہ تجویزوں کا اعادہ ہے ورنہ سب سے پہلے خود انہوں نے ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس کلکتہ میں اس کا اعلان کیا ہے تو پھر گورنمنٹ بھی چونکی اور جونہی مقدمہ سیشن کورٹ میں ہُوا، سرکاری وکیل نے دعوٰی میں ترمیم کر کے کلکتہ کانفرنس رزولیوشن بھی شامل کر دیا۔ اس پر مولانا نے ایک برقی بیان فوراً تمام اخبارات میں شائع کرایا تھا جس کی بے باک شجاعانہ اسپرٹ نہایت ہی عجیب و غریب تھی اور ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ صرف اتنی ہی ترمیم سے دعوٰی مکمل نہیں ہو سکتا اور مرحلے ابھی باقی ہیں۔

سب سے پہلے کلکتہ کانفرنس کے لیے یہ رزولیوشن میں نے تیار کیا، خود اپنے قلم سے لکھا اور میری ہی صدارت میں منظور ہُوا۔ اس کے بعد دہلی میں جمعیۃ العلماء کا جلسہ ہُوا اور میں نے اس رزولیوشن پر بصورت فتوٰی کے دستخط کیا۔ پھر بریلی میں جمعیۃ کا جلسہ ہُوا۔ اس کا بھی میں ہی صدر تھا اور صدارت کی طرف سے اس رزولیوشن کو پیش کر کے منظور کرایا تھا۔ علاوہ بریں رسالہ خلافت میں ایک خاص باب اس موضوع پر لکھ چکا ہوں اور اس کی بے شمار کاپیاں تقسیم ہو چکی ہیں۔ پھر کلکتہ، دہلی،

رہے تھے، تو ٹھیک اسی وقت گورنمنٹ کے نئے جبر و تشدد سے کلکتہ میں ایک نیا دروازۂ عمل کھل چکا تھا۔ جونہی گورنمنٹ بنگال نے رضا کاروں کی جماعت اور مجالس کو خلافِ قانون قرار دیا، فوراً اہلِ کلکتہ نے ایک ہزار دستخطوں سے نئی جماعت رضا کاران کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد مسٹر سی آر داس اور مولانا کلکتہ پہنچے، اور انہوں نے معلوم کر دیا، کہ فتح مندی کا اصلی میدان بنگال ہی میں گرم ہوگا۔ انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی یا ورکنگ کمیٹی یا مہاتما گاندھی کی اجازت کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ فوراً رضا کاروں کی تنظیم اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا روزانہ چار چار پانچ پانچ سو گرفتاریوں کی تعداد پہنچ گئی۔ بنگال کی پیش قدمی نے دوسرے صوبوں پر بھی اثر ڈالا۔ نئی حرکت ہر طرف شروع ہو گئی اور اچانک ملک میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو گئی۔ کہ لوگوں کو پچھلی افسردگی و مایوسی کا ایک گزرے ہوئے خواب جتنا بھی خیال باقی نہ رہا۔

خود مولانا کو بھی اس حقیقت کا پورا یقین تھا جیسا کہ ان کے "پیغام" مورخہ ۸ دسمبر سے واضح ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ۷ سے ۸ تک انہوں نے جو خطوط لوگوں کو لکھے، ان میں بھی صاف صاف اپنا ارادہ اور یقین ظاہر کر دیا۔ مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء دہلی کے نام ایک خط میں لکھا:-

> "بدایون کے جلسہ (جمعیت) میں شرکت کا قطعی ارادہ تھا، لیکن یہاں پہنچ کر جو حالات دیکھے اور روز بروز ظہور رہو رہے ہیں۔ ان کے بعد بہت مشکل ہو گیا ہے کہ میں کلکتہ سے نکل سکوں۔ کلکتہ سے نکلنے کے.

تعجب انگیز طور پر ان کی گرفتاری برابر ملتوی ہوتی رہی اور پھر ٹھیک اسی وقت ہوئی جب کہ تحریک کی نئی زندگی کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اگر یہی واقعہ دسمبر سے پہلے ظہور میں آجاتا، تو وہ نتائج کیوں کر حاصل ہوتے جو دسمبر کے بعد کے حالات ہی میں وقوع پذیر ہو سکتے تھے؟

۱۵ نومبر کے بعد اچانک قومی تحریک جن حالات میں گھر گئی تھی۔ اس کا صرف انہی لوگوں کو اندازہ ہے جو تحریک کے اندرونی نظم و نسق میں دخل رکھتے ہیں۔ یہ وہ موقعہ تھا کہ ملک نہایت بے چینی کے ساتھ کسی نئے اقدام کا انتظار کر رہا تھا۔ سال کے اختتام میں (جو نون کو اپریشن پروگرام کے نفاذ کی مجوزہ مدت تھی) صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے اور ساری امیدوں کا مرکز مہاتما گاندھی جی کا یہ اعلان تھا کہ پہلی دسمبر سے وہ بردولی تعلقہ میں اجتماعی سول نافرمانی شروع کر دیں گے لیکن یکایک بمبئی میں پرنس آف ویلز کے دورہ کے موقع پر شورش نمودار ہوئی اور اس سے مہاتما گاندھی جی کے ذکی الحس قلب پر ایسا شدید اثر پڑا، کہ انہوں نے نہ صرف بردولی کا کام ملتوی کر دیا، بلکہ پے در پے تین بیانات شائع کر کے اعلان کر دیا کہ موجودہ حالات میں تحریک کی ناکامی کا ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے۔

اس اعلان نے تمام ملک میں افسردگی اور مایوسی کی عام لہر دوڑا دی قریب ہی تھا کہ لوگوں کے دل بالکل ہی بیٹھ جائیں، چنانچہ ۲۲ نومبر کو جب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ممبروں پر یاس و حسرت چھائی ہوئی تھی اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کہ تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے کونسا فوری عمل اختیار کیا جائے ہ لیکن خدا کی رحمت نے فوراً چارہ سازی کی جب کہ ۲۲ نومبر کو بمبئی میں لوگ راہِ عمل سوچ

مولانا کا مضبوط، یک سُو، قطعی اور ہر طرح کی دورنگیوں اور تذبذب آمیز باتوں سے محفوظ کیریکٹر ہے۔ یہ اگرچہ ان کی پبلک لائف کے ہر حصے میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اور نظربندی کی چار سالہ زندگی میں اچھی طرح ہم اس کا اندازہ کر چکے ہیں لیکن عدالت اور باقاعدہ چارہ جوئی کی صورت نظربندی سے بالکل مختلف صورت ہے۔ پہلے میں کوئی موقع اظہار رتبت اور بحث و دلائل کا نہیں ہوتا۔ دوسرے میں سزا وہی کی بنیاد ہی بحث و دلائل اور ڈیفنس پر ہوتی ہے۔ پس دراصل ایک لیڈر کی روش اور استقامت کی اصلی آزمائش گاہ عدالت ہی کا ہال ہے۔

اس حقیقت کو دونوں پہلوؤں سے جانچنا چاہیئے۔ اس لحاظ سے بھی کہ عام طور پر ایک قومی رہنما اور سیاسی لیڈر کی روش گرفتاری کے بعد عدالت میں کیا ہونی چاہیئے اور اس لحاظ سے بھی کہ خاص طور پر نون کواپریشن اصولوں کے ماتحت ایک سچے نون کواپریٹر کو عدالت میں کیا کرنا چاہیئے؟ مولانا کی روش دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے سبق آموز ہے۔

سب سے بڑی چیز "قول اور عمل" کی مطابقت ہے۔ یعنی ہم جو کچھ کہا کرتے ہیں، وقت پڑنے پر ٹھیک ویسا ہی بلکہ اس سے زیادہ کر دکھائیں۔ مولانا نے اپنے مضبوط طرزِ عمل سے دکھلا دیا کہ وہ وقت پر اپنی کوئی بات اور کوئی دعویٰ بھی واپس لینا نہیں چاہتے۔

ایک لیڈر جب گورنمنٹ کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرتا ہے اور اظہارِ حق میں اپنے آپ کو نڈر اور بے پرواہ بتلاتا ہے، تو وہ بار بار ظاہر کرتا ہے کہ ہر طرح کی قربانیوں کے لیے تیار ہے اور گورنمنٹ کو چیلنج دیتا ہے کہ اسے جب چاہے

یہ معنی ہوں گے کہ میں ایک بہترین مہلت عمل دیدہ دانستہ
ضائع کردوں۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ شاید سول نافرمانی
کا عقدہ یہیں حل ہوگا۔ روز بروز ایک نئی شاہراہ کامیابی
کی میرے سامنے کھلتی جاتی ہے۔ یقین کیجئے کہ
بدایون کے جلسہ میں عدم شرکت کا مجھے بھی نہایت
افسوس ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالت موجودہ
کلکتہ سے نکلنا کم از معصیت نہ ہوگا۔"

واقعاتِ مابعد نے ثابت کردیا۔ کہ ان کا خیال کس قدر صحیح تھا؛ فی الحقیقت کلکتہ نے پوری شجاعت کے ساتھ میدان سر کیا اور اس کی کامیابی کے سامنے حریف کو علانیہ سر جھکانا پڑا۔ افسوس ہے کہ بدبختانہ عین وقت رہنمایانِ ملک کے قوتِ فیصلہ نے غلطی کی اور یکے بعد دیگرے ایسی لغزشیں ہوگئیں کہ ۱۸ ار ۲۳ دسمبر تک جو عظیم الشان فتح ہوئی تھی وہی شکست بن کر ہمارے سامنے آگئی۔

مقدمہ کی خصوصیات

اب ہم ان بعض امور کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے یہ سادہ اور مختصر مقدمہ ملک کے بے شمار پولیٹیکل مقدمات میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور جس میں ہماری اخلاقی اور پولیٹیکل زندگی کے لیے نہایت ہی قیمتی رہنمائی پوشیدہ ہے۔

کامل صادقانہ رَوِش سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے، وہ

اس قسم کے لوگ بھی بعد کو اپنے طرزِ عمل کی حمایت یا معذرت میں یہ حیلہ اختیار کرتے ہیں کہ لڑائی بھی ایک طرح کا فریب ہے۔ ہم نے صرف اپنے بچاؤ کے لیے دشمن سے فریب کھیلا، ورنہ دراصل ہمارے دل میں وہی ہے جو پہلے تھا۔ لوگ بھی اسے مان لیتے ہیں۔

یہ بات گویا اس قدر مسلّم اور پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی ہے کہ جب کوئی لیڈر عدالت میں ایسا رویہ اختیار کرتا ہے تو پبلک ذرا بھی تعجب نہیں کرتی اور سمجھ لیتی ہے کہ یہ سب کچھ صرف عدالت کے لیے کیا گیا ہے جہاں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ پالٹیکس میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ گویا پالٹیکس میں جھوٹ، نفاق، دو رنگی، ذلتِ نفس اور مکر و فریب کے سوا چارہ نہیں۔

۳۔ کچھ لوگ ان دونوں قسموں سے بلند تر ہیں وہ زیادہ باہمت اور نڈر دل رکھتے ہیں۔ اس لیے عدالت کے سامنے بھی ان کی جرأت و شجاعت اسی آن بان کے ساتھ نظر آتی ہے جس طرح پبلک مجمعوں میں نظر آتی ہے لیکن زیادہ دِقّتِ نظر کے ساتھ جب ان کے طرزِ عمل کو دیکھا جاتا ہے تو وہ بھی بے لاگ اور یک سُو ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ گو وہ ساری باتیں ہمت اور بے باکی کی کرتے ہیں، لیکن حقیقت اور اصلیت کے اقرار و برداشت سے انہیں بھی گریز ہوتا ہے۔ یعنی عدالت کی سزا سے بچنے کے لیے وہ بھی کوئی دقیقہ حیلے حوالوں کا اٹھا نہیں رکھتے۔ البتہ ان کی حیلہ جوئی بہت ہی مخفی اور باریک ہوتی ہے پچھلی دو جماعتوں کی طرح کھلی ہوئی اور صاف نہیں ہوتی۔ وہ گورنمنٹ کی مخالفت سے انکار تو نہیں کرتے لیکن ساتھ ہی عدالت اور قانون کی آڑ میں پناہ بھی لینا چاہتے

گرفتار کرلے۔ لیکن جب گورنمنٹ خود اسی کے اختیار کیے ہوئے طریقہ کے مطابق اسے گرفتار کرلیتی ہے اور اپنے نقطۂ نظر اور قانون کے مطابق مجرم ٹھہرا کر سزا دلانا چاہتی ہے تو پھر اس وقت سونا آگ پر تپنے لگتا ہے اور کھوٹے کھرے کی پہچان کی گھڑی آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت تین طرح کی طبیعتیں تین طرح کی راہیں اختیار کرتی ہیں۔

۱۔ کچھ لوگ جن کے زبانی دعووں کے اندر کوئی محکم ایمان اور سچائی نہیں ہوتی وہ تو فوراً اپنے دعووں سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اپنے کیے پر پشیمانی ظاہر کرکے عجز و نیاز کا سر جھکا دیتے ہیں۔ یہ سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔

۲۔ کچھ لوگ جو اس سے بلند درجہ رکھتے ہیں، ان کی طبیعت اس درجہ گر جانے کو تو گوارا نہیں کرتی، لیکن سزا سے بچنے کے لیے وہ بھی بے قرار ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بھی فوراً اپنا طرزِ عمل بدل دیتے ہیں۔ اور عدالت پر ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ جو کچھ وہ کرتے رہے، اس کا مقصد وہ نہیں ہے جو گورنمنٹ نے سمجھا ہے، بلکہ کچھ دوسرا ہی ہے۔ پھر طرح طرح سے اس کی تاویلیں کرتے ہیں اور مخالفت کو موافقت بنانا چاہتے ہیں۔ کبھی پولیس اور سی آئی ڈی کی رپورٹوں کو بالکل جھوٹا کہہ دیتے ہیں، کبھی اپنے کیے ہوئے اور لکھے ہوئے جملوں کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ بنانا چاہتے ہیں۔ کبھی گورنمنٹ کا شکوہ کرتے ہیں کہ کیوں خواہ مخواہ بلاقصور انہیں گرفتار کر لیا؟ غرض کہ اپنی تمام پچھلی شجاعانہ آمادگیوں کو فراموش کرکے اچانک ایک نئی پوزیشن اختیار کرلیتے ہیں۔ اور اگرچہ سزا سے نہ بچ سکیں لیکن سزا سے بچنے کے لیے جس قدر حیلے حوالے کر سکتے ہیں، اس میں کمی نہیں کرتے۔ پہلی قسم کی طرح

کیا جائے؟ اگر گریز ہے تو آزادی و حق طلبی کی راہ میں قدم رکھنا ہی نہیں چاہیئے لیکن مولانا کا طرزِ عمل اس اعتبار سے بالکل ایک نئی راہ ہمارے سامنے کھولتا ہے۔ انہوں نے بتلا دیا ہے کہ "قول" اور "فعل" کی مطابقت اور سچی اُوبے لاگ حقیقت پرستی کے معنی کیا ہیں؟ انہوں نے اپنے بیان میں سب سے پہلے اسی سوال پر توجہ کی ہے۔ انہوں نے صاف صاف تسلیم کر لیا ہے کہ وہ بحالتِ موجودہ گورنمنٹ کے نقطۂ نظر اور قانون سے واقعی "مجرم" ہیں اور یہ ہرگز قابلِ ملامت و شکایت نہیں ہے کہ گورنمنٹ انہیں سزا دلانا چاہتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب انہوں نے استغاثہ کے مواد کو بہت ہی کمزور پایا تو ایک ایسی جرأت کے ساتھ جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ استغاثہ کا بارِ ثبوت بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ اور خود اپنے قلم سے وہ تمام باتیں لکھ دیں جن کا ثبوت استغاثہ کے لیے بہت مشکل تھا۔ اور اس لیے وہ پیش نہ کر سکا تھا۔ اس طرح عدالت پر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ استغاثہ کے کے دعوے سے بھی کہیں زیادہ وہ گورنمنٹ کے مجرم ہیں اور یہ بالکل ایک قدرتی بات ہے کہ انہیں سزا دی جائے۔

چنانچہ ہم خود انہی کی زبانی سنتے ہیں کہ ان کا ارادہ بیان دینے کا نہ تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان کے خلاف گورنمنٹ کو جو کچھ کہنا چاہیئے وہ سب کچھ پیش کر دے گی لیکن جب کارروائی شروع ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ صرف دو تقریروں کی بنا پر استغاثہ دائر کیا گیا ہے اور وہ ان بہت سی باتوں سے بالکل خالی ہیں جو ہمیشہ وہ کہتے رہے ہیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ گورنمنٹ میرے خلاف تمام ضروری مواد مہیا کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں عدالت کو اصلیت

ہیں۔ یعنی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گو انہوں نے یہ سب کچھ کہا اور کیا ہے تاہم انہیں سزا نہیں ملنی چاہیئے۔ کیونکہ عدالت اور قانون کی رُو سے وہ ہر طرح ایک جائز فعل تھا۔ کسی طرح بھی سزا کا موجب نہیں ہوسکتا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی سخت شکایت کرتے ہیں کہ "بلا قصور" انہیں گرفتار کیا گیا۔ نیز عدالت کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو سزا کا دینا نہایت "ناانصافی" کی بات ہوگی۔ یہ طرزِ عمل ان کا اُس گورنمنٹ اور گورنمنٹ کی عدالت میں ہوتا ہے جس کے ظلم و ستم کا وہ شب و روز رونا رو چکے ہیں اور جس کے انصاف سے انہوں نے ہمیشہ مایوسی ظاہر کی ہے۔ نیز جس کی نسبت انہیں یقین بھی ہے کہ خواہ کتنی ہی قانون اور انصاف کے نام پر اپیلیں کی جائیں لیکن انہیں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑا جائیگا۔

یہ آخری قسم گویا سب سے بلند اور اعلیٰ جماعت ہے جو ہماری پولیٹیکل جدوجہد کا دَور اس وقت تک پیدا کرسکا ہے۔ لیکن "قول اور فعل" کی مطابقت سے اس کا طرزِ عمل بھی خالی ہے۔ اگر فی الواقع وہ اپنے تمام دعوؤں میں سچی تھی اور دعوتِ آزادی و حق پرستی کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار تھی، تو چاہیئے تھا کہ اپنی گرفتاری اور سزایابی کا بلا کسی اعتراض اور شکایت کے استقبال کرتی اور صاف صاف کہہ دیتی کہ فی الواقع اس نے ایسا ہی کام کیا ہے جس پر گورنمنٹ کے نقطۂ خیال کے مطابق سزا ملنی چاہیئے اور چونکہ خود اس نے اپنی پسند سے یہ راہ اختیار کی ہے اس لیے اس کے قدرتی نتائج کے لیے وہ کسی طرح گورنمنٹ کو ملامت بھی نہیں کرتی۔ گورنمنٹ دنیا کے تمام جابروں کی طرح "یقیناً" اپنے مخالفوں کو سزا ہی دے گی۔ پھولوں کا تاج نہیں پہنائے گی۔ پس جب ایک بات قدرتی طور پر ناگزیر ہے تو کیوں اس سے گریز

معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کے لیے شکوہ و شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دونوں کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیئے "

انہوں نے اپنے بیان کے آخر میں اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ آزادی حق طلبی کی جدوجہد کی مقاومت میں دنیا کی جابر گورنمنٹ جو کچھ کر چکی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اس وقت جس قدر جبر و تشدد ہو رہا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔

کیسی بے لاگ اور خاص صداقت شعاری ہے جو اس بیان سے ٹپک رہی ہے ؟ کیا اس سے بھی بڑھ کر راست بازی اور شجاعت و استقامت کی کوئی مثال ہو سکتی ہے ؟

لوگوں کو شیوۂ حق گوئی کے اس نئے نمونہ پر اگر تعجب ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کیونکہ ابھی ہم اس مقام سے بہت ہی دُور پڑے ہوئے ہیں ابھی ابھی تک تو ہمارا یہ خیال ہے کہ پالٹیکس میں ہر طرح کی ہٹ دھرمی اور صریح غلط بیانی تک جائز ہے۔

مولانا کا یہ طرزِ عمل عام خیالات سے کس قدر مختلف ہے ؟ اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہوگا۔ مولانا نے مندرجہ بالا مطالب لکھتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں : " کہا جا سکتا ہے کہ پہلے فریق کی طرح دوسرے فریق کی جدوجہد بھی قابلِ ملامت نہیں " یعنی قوم کی طرح گورنمنٹ بھی اپنی جدوجہد میں قابلِ ملامت نہیں۔ چونکہ یہ خیال عام خیال سے بالکل ہی بعید تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ کہ گورنمنٹ کو بھی اس کی جابرانہ جدوجہد میں ناقابلِ ملامت مانا جائے

سے باخبر کردوں۔" وہ تسلیم کرتے ہیں کہ "قواعدِ عدالت کی رُو سے یہ میرا فرض نہیں ہے"۔ مگر چونکہ "حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی جیاہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے"۔ اس لیے "یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا، کہ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ کی ہیں چھوڑ دی جائے کہ مخالف اپنے عجز کی وجہ سے ثابت نہ کرسکا"۔

اس کے بعد انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ کیوں "جرم" کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس لیے کہ جب ایک قوم اپنے ملک کی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کا مطالبہ اس وقت سے ہوتا ہے جو عرصہ سے اس کے ملک پر قابض و مُتصرّف ہے۔ کوئی انسان یہ پسند نہیں کرے گا۔ کہ اس کے قبضہ میں آئی ہوئی چیز واپس چلی جائے۔ پس قدرتی طور پر یہ مطالبہ قابض طاقت پر شاق گزرتا ہے اور جہاں تک اس کے بس میں ہوتا ہے وہ اپنے فوائد کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ یہ جدوجہد کتنی ہی خلافِ انصاف ہو مگر کسی طرح بھی قابلِ ملامت نہیں ہے کیونکہ ہر وجود اپنی حفاظت کے لیے ضرور ہاتھ پاؤں مارے گا۔ ایسا ہی مقابلہ ہندوستان میں شروع ہو گیا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ جو لوگ موجودہ بیوروکریسی کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں، بیوروکریسی بھی ان کی مخالفت میں جدوجہد کرے اور جہاں تک اس کے امکان میں ہے ان کو سزائیں دے۔ چونکہ وہ نہ صرف جدوجہد کرنے والے ہیں بلکہ اس جدوجہد کی دعوت دینے والے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ انہیں سزا دی جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں گورنمنٹ سے یہ توقع رکھوں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی جو ہمیشہ طاقت نے آزادی کی جدوجہد کے مقابلے میں کیا ہے۔ پس یہ ایک ایسا قدرتی

ہے؟ انہوں نے اظہارِ بے جرمی کی جگہ جرم کا صاف صاف اعتراف کیا اور بجائے انصاف کی اپیل کرنے کے عدالت کو خود ہی اپنے تمام جرائم کی فہرست سنا دی۔ ساتھ ہی اوّل سے آخر تک کسی طرح کی قانونی بحث نہیں کی، ایک حرف بھی اس بارے میں ہم ان کی زبان سے نہیں سنتے۔ حتّٰی کہ یہ تک نہیں پوچھتے کہ جو دفعہ ان پر لگائی گئی ہے واقعی ان کی تقریریں اس میں آتی بھی ہیں یا نہیں؟ اور آتی ہیں تو کیوں کر؟ وہ تو خود ہی اپنی تقریروں کے تمام سخت سخت مقامات نقل کر دیتے ہیں اور سی آئی ڈی کے رپورٹوں کی نا قابلیت سے جہاں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اس کو استغاثہ کے حسب منشا مکمل کر دیتے ہیں۔ فی الحقیقت ترک موالات اور عدالتوں کے مقاطعہ سے اصل مقصود یہ تھا جس کا مکمل نمونہ ہم ان میں دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں تھا کہ ڈیفنس اور بریت کا ایک طریقہ چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔

جو لوگ صاحب نظر و انصاف ہیں وہ یقیناً اس طرزِ عمل سے متاثر ہوئے اور متاثر ہوں گے۔ مولانا کے بعد ہی لاہور میں لالہ لاجپت رائے جی پر دوبارہ مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن جب ان سے پوچھا گیا۔ کہ وہ کوئی بیان دیں گے؟ تو جواب میں انہوں نے کہا: "چونکہ بیان میں ازروئے قانون اپنی بریّت کو لازمی طور پر لکھنا پڑے گا۔ اور یہ نون کواپریشن کے خلاف ہے۔ اس لیے غور کرنے کے بعد اب میری رائے یہی ہو گئی ہے کہ کوئی بیان نہیں دینا چاہیئے" گویا انہوں نے بھی مولانا کے طرزِ عمل کی تائید کی۔

جب تک ایک حقیقت نظروں سے مستور رہتی ہے اس کا عام طور پر احساس نہیں ہوتا۔ لیکن جب سامنے آتی ہے تو پھر تعجب ہوتا ہے کہ اتنی صاف

اس لیے تمام اخبارات نے اسے کتابت کی غلطی سمجھا۔ اور "کہا جا سکتا ہے" کی جگہ "کہا جاتا ہے" بنا دیا۔ گویا گورنمنٹ یا اس کے طرف دار ایسا کہتے ہیں ورنہ دراصل ایسا نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے بعد کی عبارت بالکل اس تبدیلی کے خلاف تھی یہ جو کچھ ہمیں نظر آیا۔ مولانا کے مسلک کی عام حیثیت تھی۔ اگر "ترکِ موالات" کا پروگرام نہ ہوتا جب بھی وہ ایسا کرتے۔ لیکن اب اس اعتبار سے بھی دیکھنا چاہیئے کہ "ترک موالات" کا اصول ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے طرزِ عمل کا کیا حال ہے؟

ترکِ موالات اور عدالت کے بائیکاٹ سے مقصود یہ تھا کہ عدالت میں کسی طرح کا بھی ڈیفنس نہ کیا جائے۔ یعنی اپنے کو سزا سے بچانے کے لیے کوئی کارروائی نہ کی جائے کیونکہ نون کوا پریشن عدالت کے انصاف اور جواز ہی سے منکر ہے۔ اس اعتبار سے بھی مولانا نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ڈیفنس نہ کرنے کے کیا معنی ہیں۔

بہت سے لوگوں نے "ڈیفنس نہ کرنے" پر صرف اتنا ہی عمل کیا کہ عدالتی دستور کے مطابق وکلاء اور قانون پیشہ اشخاص کو اپنی طرف سے مقرر نہیں کیا۔ لیکن جہاں تک اصل ڈیفنس کا تعلق ہے اس میں انہوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ پوری طرح اپنی بے قصوری اور استغاثہ کے خلاف قانون و انصاف ہونے پر بحثیں کیں اور ہر طرح کے قانونی مواد سے استدلال کیا۔ بعض حالتوں میں عدالتوں سے انصاف کی اپیل بھی کی گئی۔ یعنی خود اپنی زبان و قلم سے وہ سب کچھ کر گزرے جو وکیل اور کونسل ان کی جانب سے ڈیفنس میں کر سکتا تھا۔ پس فی الحقیقت یہ "ڈیفنس نہ کرنا" نہیں ہوا۔ بلکہ براہِ راست خود "ڈیفنس کرنا" ہوا۔

لیکن مولانا کا طرزِ عمل کس قدر یک سو اور کامل معنوں میں ڈیفنس سے مبرا

فرض انجام دے رہا ہے اور حکومت کی مشینری کا ایک جزو ہے۔ جب تک مشینری میں تبدیلی نہ ہو اس کے اجزاء کے افعال میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ پس اس سے بھی انہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ ان کے بیان کا خاتمہ بے حد مؤثر ہے وہ ضرب المثل کی طرح ہمارے لٹریچر میں زندہ رہے گا۔ جس طرح بیان کے بہت سے جملے اپنی لفظی و معنوی خوبصورتی و صداقت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ہم بیان کے مطالب کی اہمیت، طرزِ بیان کی دل نشینی، اسلامی حریت کی عالمانہ ترجمانی اور فرائضِ ملک و ملّت کی بہترین سبق آموزی کی قدر و قیمت کا اندازہ ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں اور مولانا ہی کے لفظوں میں یہ کہہ کر اپنی گزارش ختم کر دیتے ہیں کہ:

"مستقبل فیصلہ کرے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔"
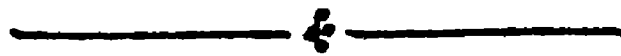
جذبات پر قابو رکھنا چاہیئے۔ کسی انسان کی بڑائی کے لیے یہ کم سے کم بات ہے کہ وہ وقت پر اپنے غصہ کو ضبط کر سکے۔ بہت سے لوگ یہ غلطی بھی کر جاتے ہیں کہ شجاعت و ہمت اور طیش و غضب میں کوئی فرق نہیں کرتے بہت زیادہ غصہ میں آجانے کو ہمت اور بہادری کی بات سمجھتے ہیں، حالاں کہ سچا اور بہادر وہی ہے جو تکلیف جھیلنے میں اس قدر مضبوط ہو کہ تکلیف دیکھ کر اسے غصہ ہی نہ آئے۔ علاوہ بریں غصہ اور طیش کے ہیجان میں واقعات اور حقیقت کی تاثیر بھی نمایاں نہیں ہو سکتی۔

مولانا کے طرزِ عمل کی ایک بڑی نمایاں بات ان کی بے حد متانت اور سنجیدگی ہے۔ عدالت کی تمام کارروائیوں کی اثنا میں کہیں بھی یہ نظر نہیں آتا۔ کہ وُہ غصہ میں بھرے ہوئے ہیں۔ یا دشمن کے قابو میں اپنے آپ کو پا کر پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ برخلاف اس کے ان کے "بیان" کی ہر سطر سے کامل متانت اور ضبط ٹپکتا ہے اور جس حصے کو دیکھا جائے جذبات کے جوش کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ انہوں نے سخت سے سخت جوش انگیز پولیٹیکل مُعاملات پر اس طرح بحث کی ہے، گویا ایک شخص نہایت سادگی کے ساتھ محض واقعات و حقائق پر لیکچر دے رہا ہے وہ گویا گرفتار ہونے کے بعد غضبی جذبات سے بالکل خالی ہو گئے تھے۔

اس سے بھی زیادہ مؤثر مقام بیان کا خاتمہ ہے۔ جہاں انہوں نے اُن تمام لوگوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے خلاف مقدمہ میں کام کر رہے تھے۔ اپنے مخالف گواہوں سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ کی نسبت پوری خوش دلی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ انہیں کوئی شکایت یا رنج ان سے نہیں ہے۔ اور اگر ان سے کوئی قصور اس بارے میں ہوا ہے تو سچے دل سے معاف کر دیتے ہیں۔ مجسٹریٹ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ تو اپنا

کا پروگرام میرے سامنے تھا لیکن اچانک بنگال میں گورنمنٹ کی نئی سرگرمی شروع ہوگئی اور اس کے بعد دوسرے صوبوں میں بھی اس کی تقلید کی گئی۔ میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے جلسہ کی وجہ سے بمبئی میں تھا۔ مہاتما گاندھی جی سے میں نے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ چند دنوں کے لیے کلکتہ چلا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ یکم دسمبر کو میں کلکتہ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ گورنمنٹ نے آخری حد تک تشدد کا ارادہ کر لیا ہے اور کوئی ناجائز طریقہ ایسا نہیں ہے جو ۲۴ کی ہڑتال روکنے کے لیے عمل میں نہ آ رہا ہو۔ تاہم لوگ پوری استقامت کے ساتھ صبر و سکون پر قائم ہیں۔

میرا پہلا کام یہ تھا۔ کہ لوگوں کے ایمان اور استقامت دونوں کی نسبت اطمینان حاصل کر لوں۔ یہ اطمینان ۵ تک حاصل ہوگیا۔ اب میں نے سوچا۔ کہ کلکتہ سے باہر جاؤں یا نہ جاؤں؟ بدایون کے جلسۂ جمعیت میں جانا بھی نہایت ضروری تھا۔ ۶ تک متذبذب رہا میں نے مہاتما گاندھی جی کو لکھا دیا۔ کہ بقیہ کاموں کے لیے مسٹر سی آر داس کافی ہوں گے۔ میں بدایون ہو کر بمبئی آتا ہوں۔ لیکن ۶ کی شام کو یکایک حالات نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آتی ہے اور گویا مقابلہ کا فیصلہ کن میدان یہیں پیدا ہوگیا ہے۔ پس میرے لیے ضروری ہوگیا۔ کہ تمام کاموں کو ترک کر کے کلکتہ کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں یہیں رہوں گا۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ جابرانہ احکام واپس لے لے یا مجھے گرفتار کر لے۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ گورنمنٹ نے خلافت اور کانگریس کمیٹیوں کو بالکل توڑ دینے اور معطل کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام کارکن گرفتار کیے جا رہے

پیغام

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا
وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ؕ

مباش غم زدہ عرفی کہ زلف و قامتِ یار
جزاءِ ہمتِ عالی و دستِ کوتہِ ماست!

آج ۸ر دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ہے۔ کل شام کو مجھے قابلِ وثوق ذرائع سے اطلاع مل گئی ہے کہ گورنمنٹ بنگال نے وائسرائے کے مشورہ کے بعد میری اور مسٹر سی آر داس کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا ہے میری نسبت گورنمنٹ کا ارادہ یہ ہے کہ اگر میں گیارہ تاریخ تک کلکتہ سے باہر نہ گیا تو مجھے گرفتار کرلے گی، لیکن اگر میں بدایوں کے جلسہ جمیعۃ العلماء کے لیے چلا گیا تو پھر گویا اس کے سر سے بلا ٹل جائے گی۔ صرف مسٹر داس گرفتار کر لیے جائیں گے۔

میرا وقت تمام تر بنگال سے باہر ہندوستان کے کاموں میں خرچ ہوتا رہا ہے اس وقت بھی میں تحریک کے نہایت اہم کاموں میں مشغول تھا، اور ۲۵ر دسمبر تک

"آخری اور فتح مند میدان" کہا۔ یہ میرا یقین ہے اور عنقریب تمام ملک دیکھ لے گا
کہ جو کام دو سال کے اندر تمام ملک میں انجام نہ پا سکا۔ وہ ان چند دنوں کے اندر
کلکتہ میں انجام پا جائے گا۔

البتہ اس آخری کام کی تکمیل اور مضبوطی کے لیے ایک آخری مرحلہ باقی ہے
اور میں بے فکر ہو گیا ہوں کہ گورنمنٹ بنگال کے ہاتھوں وہ بھی پورا ہو جائیگا
اگر وہ تین دن کے اندر مجھے اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کو گرفتار کر لیا گیا۔ تو یہ نہ صرف
کلکتہ بلکہ تمام بنگال کو ایک نئی بیداری اور زندگی سے معمور کر دے گا۔ بنگال کو ہم
دو سال تک آزادی کے لیے بیدار نہ کر سکے۔ لیکن ہماری گرفتاری ایک منٹ کے اندر
بیدار کر دے گی۔

میں اپنی گرفتاری میں تمام مسلمانان ہند کی ایک نئی کروٹ دیکھ رہا ہوں۔
مجھے خاص طور پر پنجاب، صوبہ سرحد اور بہار پر اعتماد ہے۔ ان تین صوبوں کے
مسلمانوں نے ہمیشہ میری صداؤں کو محبت، اعتماد اور قبولیت کے ساتھ سنا
ہے۔ وہ گزشتہ دس سال سے میری تمام امیدوں کا مرکز ہیں۔ مجھے یقین ہے
کہ میری گرفتاری ان کے لیے آخری دعوت عمل ہوگی۔ جو حقیقت تین سال کی
پیہم تقریروں اور تحریروں میں نہیں سمجھا سکا تھا۔ وہ میری گرفتاری کی خاموشی
سمجھا دے گی۔

اس طرح گورنمنٹ بنگال صرف بنگال ہی کے لیے نہیں۔ بلکہ تمام ملک
کے لیے ایک بہترین خدمت انجام دے رہی ہے۔

اولین مبارکباد

اگر میں گرفتار ہو گیا۔ تو مہاتما گاندھی کو میرا

ہیں۔ قومی اخبارات بھی عنقریب بند کر دیے جائیں گے۔ مسٹر داس بالکل تنہا رہ گئے ہیں۔ اس بنا پر بھی میرے لیے کلکتہ چھوڑنا ناممکن تھا۔

یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ بنگال مجھے گرفتار کرنے سے بچنا چاہتی ہے اور منتظر ہے کہ میں کلکتہ سے باہر چلا جاؤں۔ گورنمنٹ کے ایک بھیجے ہوئے دوست نے مجھے اس سے مطلع بھی کر دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ گورنمنٹ کی تمام خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی میری خواہش سے متضاد ہے اور میرا موجودہ فرض تعمیل نہیں ہے بلکہ خلاف ورزی۔

میں نے پوری طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ بلاشبہ بہت سے کاموں کے لیے میں اپنی موجودگی ضروری دیکھتا ہوں۔ کام اور ضرورت کا یہ حال ہے، کہ جس قدر بھی مل جائے اس سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن اللہ کے فضل نے کلکتہ میں جو میدانِ عمل پیدا کر دیا ہے، وہ بھی ہر اعتبار سے مجھے قیمتی اور اہم معلوم ہوتا ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ میرا انتخاب غلط نہ ہوگا۔

گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے؟ محمد علی، شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری مگر فتح مند میدان اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں میں نے کلکتہ کے موجودہ میدانِ عمل کو،

لَا تَہِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ط

"نہ تو ہراساں ہو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب پر غالب رہو گے۔ اگر سچا ایمان اپنے اندر پیدا کر لو"

ہماری تمام فتح مندیوں کی بنیاد چار سچائیوں پر ہے اور میں اس وقت بھی ملک کے ہر باشندے کو انہی کی دعوت دیتا ہوں۔

۱۔ ہندو مسلمانوں کا کامل اتفاق۔

۲۔ امن۔

۳۔ نظم

۴۔ قربانی اور اس کی استقامت۔

مسلمانوں سے میں خاص طور پر التجا کروں گا کہ اپنے اسلامی شرف کو یاد رکھیں اور آزمائش کی اس فیصلہ کُن گھڑی میں اپنے تمام ہندوستانی بھائیوں سے آگے نکل جائیں۔ اگر وہ پیچھے رہے تو ان کا وجود چالیس کروڑ مسلمانانِ عالم کے لیے شرم و ذلت کا ایک دائمی دھبہ ہو گا۔

میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں اور بھی کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اس مبارک اتفاق کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی جی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی

یہ پیغام پہنچا دیا جائے :-

"میں آپ کو آپ کی فتح یابی پر سب سے پہلے مبارک دیتا ہوں اس مبارک بادی کے لیے آپ مجھے جلد باز نہ سمجھیں، میں اس اٹل وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں کہ اس کی مبارک باد میں کوئی دوسرا مجھ پر سبقت نہ کر جائے۔ آپ کے ساتھ انسانی رفاقت روز بروز گھٹ رہی ہے مگر خدا کی مدد بڑھتی جاتی ہے۔ بمبئی کے حادثہ نے آپ کے دل کو بہت صدمہ پہنچایا۔ میں آپ کو افسردہ اور غمگین دیکھ کر نہایت دردمند ہوا تھا۔ لیکن اب کلکتہ اٹھا ہے۔ تاکہ غمگینی کی جگہ خوشی اور کامیابی کا تحفہ آپ کے سامنے پیش کرے۔ آپ نے ۲۵ نومبر کی شام کو مجھ سے کلکتہ کے بارے میں گفت گو کی تو میں نے آپ کو اطمینان دلایا تھا۔ میں خوش ہوں کہ میرا اطمینان بالکل صحیح نکلا۔ کلکتہ میں میں پندرہ سال سے کام کر رہا ہوں۔ نصف صدی کی خاندانی زندگی رکھتا ہوں۔ اس لیے میرا اطمینان علم و یقین پر مبنی تھا۔ گزشتہ تین سال کے اندر تحریکِ خلافت کے سب سے اہم کام کلکتہ ہی کے مسلمانوں نے انجام دیے ہیں۔ اب آخری منزل میں بھی پہلا قدم وہی اٹھائے گا جس نے بامن قربانی کا راز پالیا ہے۔ وہ نہ تو بھڑکے گا نہ ہی بجھے گا۔ مگر اس کی آگ برابر سلگتی رہے گی۔ باامن سول نافرمانی کی منزل طے کرنا اسی کے حصہ میں آیا ہے اور وہ اس کا حق دار تھا۔"

آخری پیغام میرا آخری پیغام وہی ہے۔ جو اب سے دس برس پہلے پہلا پیغام تھا :-

میرا ارادہ ہے کہ دسمبر کے وسط میں ایک خاص تاریخ عام وصولی کے لیے قرار دی جائے اور جس طرح مردم شماری کے وقت انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر جگہ انتظام کیا جائے۔ پہلے سے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں وقت چندہ جمع کرنے والے نکلیں گے۔ ہر شخص حتی الامکان اپنے مکان میں رہے۔ پھر وصول کرنے والے تمام شہر میں پھیل جائیں۔ اور ہر مسلمان کے آگے دستِ سوال دراز کریں۔ کم از کم ایک مرتبہ تو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کا ہر مسلمان حفاظتِ اسلام و خلافت کے لیے کچھ نہ کچھ مالی قربانی کرے۔

لیکن کلکتہ پہنچ کر جب ملک کی عام حالت پر نظر ڈالی تو یہ وقت اس کے لیے موزوں معلوم نہ ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ احمد آباد خلافت کانفرنس میں اس کا اعلان ہو جائے اور جنوری کے پہلے ہفتہ کی کوئی تاریخ مقرر کر دی جائے۔

جمعیۃ العلماء کا وجود اس وقت سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ وہ علماء کا مجمع ہے اور علماء کے سوا کوئی نہیں جسے مسلمانوں کی دینی و دنیوی رہنمائی و پیشوائی کا منصب حاصل ہو۔ جمعیۃ کے سامنے اس وقت ایک نہایت اہم اسلامی مسئلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ تمام ارکانِ جمعیۃ کو توفیق بخشے۔ کہ اجتماع بدایون میں کامل اتفاق و اجماع کے ساتھ کسی بہتر فیصلہ پر پہنچیں۔ سردست میں ارکانِ جمعیۃ سے باادب عرض کروں گا:-

۱۔ آپ سب کا باہمی اتحاد بہر حال میں ضروری اور تمام مقاصد کے لیے بنیاد کار ہے۔

۲۔ ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی ضرورت و اہمیت اور شرعی استحسان آپ کی

ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہ چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔

مرکزی خلافت کمیٹی مرکزی خلافت کمیٹی کے کاموں کی طرف سے میں مطمئن ہوں۔ اس کے باہمت اور سرگرم سیٹھ چھوٹانی صاحب کی موجودگی ہر طرح کفایت کرتی ہے۔ میرے عزیز ڈاکٹر سید محمود سیکرٹری منتخب ہو چکے ہیں اور نہایت سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی اعانت کے لیے مسٹر احمد صدیق کھتری پیشتر سے موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ دفتر کے تمام اخوان و ارکان ان باتوں کو فراموش نہ کریں گے۔ جو گزشتہ قیام بمبئی کے موقع پر میں نے ان سے کہی تھیں۔ ان کی متحدہ زندگی اور سعی ہماری عدم موجودگی کی پوری طرح تلافی کر دے گی۔

حکیم محمد اجمل خاں صاحب حکیم صاحب کو میرا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ اب آپ کے دوش ہمت پر صرف آپ ہی کے فرائض کا نہیں بلکہ ہم سب کا بوجھ آ پڑا ہے۔ حکمتِ الٰہی کا منشا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا یہ کہ تمام کام آخر تک آپ ہی انجام دیں۔ بہتر یہ ہے کہ اب آپ بمبئی تشریف لے جائیں اور دہلی کی فکر چھوڑ دیں۔

انگورہ فنڈ افسوس ہے کہ انگورہ فنڈ کی مزید تکمیل کا مجھے موقع نہیں ملا۔ غالباً اس وقت تک دس لاکھ روپیہ فراہم ہو گیا ہے۔ پہلے آخر دسمبر تک کا زمانہ قرار پایا تھا۔ اب بہتر ہوگا۔ کہ ایک ماہ کی مدت اور بڑھا دی جائے اور جنوری کے آخر تک فراہمی کا سلسلہ جاری رہے۔

گرفتاری

جمعہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء

۲ دسمبر سے مولانا اور مسٹر سی آر داس کی گرفتاری کی افواہ گرم تھی۔ لیکن ۷ رکو قابلِ وثوق ذرائع سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ تاہم ۱۰ ر تک گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ ۸ ر اور ۹ رکو صرف یہ نظر آیا۔ کہ بڑی کاوش کے ساتھ دریافت کیا جا رہا ہے کہ مولانا بدایون کے جلسہ جمعیتہ العلماء کے لیے جا رہے ہیں یا نہیں؟ اگرچہ کئی دن پیشتر سے اس کا اعلان ہو چکا تھا۔ کہ اب وہ کلکتہ سے باہر نہیں جائیں گے اور سفر کا پورا پروگرام منسوخ کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض درمیانی اشخاص سے بھی انہوں نے زبانی صاف صاف کہہ دیا تھا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ آخر تک ان کے سفر کی توقع باقی تھی۔ اس لیے تفتیش جاری رہی۔

بدایون کا جلسہ ۱۰ ر ۱۱ ر تاریخ کو تھا۔ اس کے لیے کلکتہ سے روانگی کی آخری تاریخ ۸ ر تھی یا حد درجہ ۹ ر۔ پس گویا ۹ رکی شام تک اس کا انتظار کیا گیا۔

اس اثنا میں رضاکاروں کی تنظیم اور تبلیغ کا کام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، روزانہ گرفتاریوں کی تعداد بھی روز افزوں تھی۔ ۱۰ رکی صبح تک ایک ہزار سے زیادہ

نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی پوری حفاظت کرنی چاہیئے اور اس کی حفاظت آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

۳۔ احمد آباد کانگرس میں تمام علماء اسلام کو اور خاصہ ارکانِ جمعیتہ کو ضرور شریک ہونا چاہیئے اور جمعیتہ العلماء کی جانب سے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

۴۔ لاہور میں ارکانِ عامہ کی جو تجویز منظور ہوئی ہے اس پر فوراً عملدرآمد شروع ہو جائے اور جہاں تک جلد ممکن ہو مجوزہ تعداد ممبروں کی بہم پہنچائی جائے۔

گورنمنٹ بنگال آخر میں مجھے گورنمنٹ بنگال کے لیے بھی ایک پیغام لکھنا ہے: "۲۴ رکی ہڑتال ضرور ہوگی اور خلافت اور کانگرس رضاکاروں کا سلسلہ ہماری گرفتاری کے بعد دوگنی طاقت کے ساتھ جاری رہیگا۔

عزیزانِ ملک و ملت میں چار سال نظر بند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوا اور دو سال کے بعد اب پھر جیل جا رہا ہوں اللہ آپ سب کا مددگار ہو اور راہِ خدمتِ حق میں مستقیم رکھے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ؕ

۸ر دسمبر۔ کلکتہ

احمد

معمولی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ مجھے بڑا ہی رنج ہوتا۔ اگر کسی کارکن نے میرے لئے ملاقات کے لیے اپنا ایک گھنٹہ بھی ضائع کیا۔

اس کے بعد وہ روانہ ہو گئے۔ مسٹر گولڈی موٹر کار تک ساتھ گئے جو مکان سے کسی قدر فاصلے پر کھڑی کی گئی تھی لیکن مولانا کے ساتھ صرف انسپکٹر بیٹھا وہ خود دوسری کار پر چلے گئے۔

اس طرح زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے اندر کامل سکون اور خاموشی کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا گیا کسی شخص نے بھی محسوس نہیں کیا کہ کوئی نئی بات پیش آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا روزمرہ کا ایک معمولی واقعہ ہے جس میں دونوں فریق کے لیے کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی۔ جو لوگ آئے وہ بھی بالکل سنجیدہ اور معمولی انداز میں تھے اور جو گیا، وہ بھی معمولی متین اور شگفتہ حالت میں تھا۔ دفتر کے تمام لوگوں کو تو ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ اپنے روزانہ معمول کے مطابق کانگریس آفس میں جا رہے ہیں۔

ٹھیک اسی وقت مسٹر کِڈ ڈپٹی کمشنر پولیس مع دو تین بنگالی انسپکٹروں کے مسٹر سی۔ آر۔ داس کے یہاں گئے اور انہیں ساتھ لے آئے۔

جو سادہ طریقہ گرفتاری کے لیے اختیار کیا گیا وہ بالکل نیا ہے اس سے پہلے کبھی یہ روش اختیار نہیں کی گئی تھی، کوئی گرفتاری بھی ہمیں یاد نہیں جو بغیر پولیس اور فوج کی نمائش کے عمل میں آئی ہو۔ خود مولانا کو ۱۹۱۶ء میں جب نظر بند کیا گیا تو رات کے ۳ پچھلے پہر کا محفوظ وقت اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا اور ایک فوجی حملہ کی شان سے قوت کی نمائش ہوئی تھی۔ تین بجے پولیس افسروں اور سپاہیوں کی

رہنما گرفتار ہو چکے تھے۔

دیکر مولانا اور مسٹر داس نے آئندہ کام کے نظام کی نسبت از سر نو مشورہ کیا اور یہ بات بھی طے کر دی گئی کہ اگر وہ دونوں یک وقت گرفتار کر لیے گئے تو مسٹر شیام سندر چکرورتی ان کی جگہ کام کریں گے۔ وہ بھی گرفتار ہو گئے تو یکے بعد دیگرے فلاں فلاں اصحاب کام ہاتھ میں لیتے رہیں گے۔

۱۰ کو ساڑھے چار بجے مسٹر گولڈنی ڈپٹی کمشنر اسپیشل برانچ ایک یورپین انسپکٹر پولیس کے ہمراہ آئے اور مولانا کو دریافت کیا۔ مولانا اوپر کی منزل میں اپنے نوشت خواند کے کمرے میں تھے اور مسٹر فضل الدین احمد سے خطوط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے گولڈنی کو وہاں بلوایا۔ مسٹر گولڈنی نے سلام کے بعد کہا۔ کیا وہ ان کے ہمراہ چلیں گے؟ وہ انہیں لینے کے لیے آئے ہیں۔ مرد احمد نے پوچھا۔ کیا آپ کے ہمراہ وارنٹ ہے؟ جواب میں انکار کیا گیا۔ مگر مولانا نے کہا کہ وہ بلا وارنٹ کے بھی چلنے کے لیے مستعد ہیں۔ اس کے بعد وہ اندر مکان میں گئے اور پانچ چھ منٹ کے بعد واپس آکر جانے کے لیے مستعدی ظاہر کی۔ انسپکٹر نے کہا۔ اس قدر جلدی نہ کیجئے۔ اگر کوئی چیز آرام کے لیے ساتھ لینا چاہتے ہیں تو لے لیجئے لیکن انہوں نے صرف ایک گرم چادر اوڑھ لی اور کوئی چیز ساتھ نہ لی۔

جاتے وقت انہوں نے صرف یہ کہا: کلکتہ اور باہر کے تمام احباب تک میرا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ تمام لوگ اپنے اپنے کاموں میں پوری مستعدی کے ساتھ مشغول رہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے کوئی شخص نہ آئے۔ نہ اپنی جگہ اور کام کو چھوڑے۔ گرفتاریوں کو ایک معمولی اور متوقع واقعہ کی طرح محسوس کرنا چاہیے۔ کسی طرح کی خلاف

معلوم ہوا جب شہر میں اس کا اعلان کیا گیا۔ جاتے وقت بہت سے لوگوں نے انہیں موٹر کار میں ایک یورپین کے ساتھ بیٹھے دیکھا لیکن کسی کو بھی یہ خیال نہ ہوا۔ کہ وہ جیل جا رہے ہیں۔ جب وہ موٹر کار میں سوار ہو رہے تھے تو حسب معمول کچھ دوکاندار اور کچھ راہ گیر سلام کرنے کے لیے جمع ہو گئے، جیسا کہ وہ ہر روز آتے اور جاتے کیا کرتے تھے لیکن انہوں نے بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔ فی الحقیقت یہ طریقہ فریقین کے لیے ہر طرح آرام دہ اور بہتر ہے۔ کاش گورنمنٹ ابتدا سے اسی پر عمل کرتی تو بہت سی دقتیں اور پریشانیاں نہ اسے پیش آتیں نہ ملک کو۔

مولانا کو پہلے پولیس کمشنر کے آفس پہنچایا گیا۔ تقریباً بیس منٹ وہاں بیٹھے ہوں گے کہ مسٹر سی آر داس بھی وہیں پہنچا دیے گئے۔ پھر ایک موٹر کار لائی گئی، اس میں دونوں سوار ہوئے۔ ایک یورپین پولیس آفیسر موٹر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور موٹر پریذیڈنسی جیل (علی پورا) کی طرف روانہ ہو گئی۔ موٹر کار اس وقت بھی بالکل کھلی تھی۔ پریذیڈنسی جیل میں پیشتر سے اطلاع دے دی گئی تھی اور تمام انتظامات مکمل تھے۔ پولیس افسر نے دونوں صاحبوں کو جیلر سے ملایا اور اس کے حوالے کر کے واپس چلا آیا۔

مولانا نے جیل کے آفس میں مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد سپرنٹنڈنٹ سے انہیں ملایا گیا۔ یہ دراصل سپرنٹنڈنٹ کے سامنے قیدیوں کو حسب قاعدہ پیش کرنا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا: میں نے کھانے کے لیے حکم دے دیا ہے۔ نہیں معلوم اس حکم کا مقصد کیا تھا؟ کیونکہ اس کا کوئی نتیجہ ظہور میں نہیں آیا۔ اگر مقصد یہ تھا کہ تمہارے مکان سے کھانا طلب کر لینے کا حکم دے دیا ہے تو باوجودیکہ دونوں صاحبوں

مسلح جماعت ڈپٹی کمشنر کے ماتحت پہنچی، جس میں علاوہ سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، دو انسپکٹر اور پانچ سب انسپکٹر بھی تھے اور سب انسپکٹر کے سوا سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ سپاہیوں نے پہلے دور تک سڑک کی ناکہ بندی کی۔ پھر مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد دروازہ پر دستک دی گئی۔ برخلاف اس کے اس مرتبہ معمولی ملاقاتیوں کی طرح آ گئے۔ اور چپ چاپ اپنے ساتھ لے گئے۔ پولیس کی وردی اور فوج کے اسلحہ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

مولانا جس مکان میں رہتے ہیں۔ وہ علاقہ کے تھانے سے بالکل ملا ہوا ہے۔ صرف دیوار بیچ میں حائل ہے لیکن تھانے میں کوئی تیاری نمایاں نہیں کی گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب گورنمنٹ نے کم از کم دو باتیں ضرور سمجھ لی ہیں۔ جن کے سمجھنے سے اب تک اسے انکار تھا۔ اول یہ کہ ملک کے لیڈر جب کہتے ہیں کہ گرفتار ہونے کے لیے بالکل تیار ہیں تو یہ کوئی ڈپلومیسی نہیں ہے بلکہ واقعی ان کے دل کی سچی آواز ہے۔ پس ان کو گرفتار کرنے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ صرف اطلاع دے دینا ہی کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے موقعوں پر طاقت کی نمائش ہی سے گرفتاری کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ غیر معمولی اہتمام اور پولیس کا ہجوم دیکھ کر فوراً پبلک معلوم کر لیتی ہے۔ کہ گرفتاری کے لیے لوگ آئے ہیں اور پھر اچانک عوام میں بھی جوش اور سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو گرفتاری کا بروقت کسی کو بھی علم نہ ہو اور نہایت آسانی اور تیزی سے کام انجام پا جائے۔

چنانچہ مولانا کی گرفتاری کا واقعہ خود اطراف و جوانب کے لوگوں کو بھی اسی وقت

"یہ اطمینان اور بے فکری صرف اس لیے نہ تھی کہ جیل میں آ گیا۔ بلکہ اس لیے تھی کہ کاموں کی تکمیل کے لیے مجھے اپنی گرفتاری کے ضروری ہونے کا کامل یقین تھا۔ گرفتار ہونے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا، گویا ایک بڑے پریشان کن بوجھ سے دماغ ہلکا ہو گیا ہے۔"

پہلے اسی وارڈ میں مولوی عبدالرزاق ایڈیٹر پیغام، بابو پدم راج جین، مسٹر داس کے لڑکے اور کئی پولیٹیکل قیدی رکھے گئے تھے۔ لیکن جب دونوں صاحب یہاں لائے گئے تو دوسرے دن صبح ہی سب کو دوسرے وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ صبح کو کرنیل ہملٹن سپرنٹنڈنٹ اور جیلر وارڈ میں آئے۔ کرنیل ہملٹن اپنی ذات سے ایک شریف شہری ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ حالات کی نوعیت سے وہ متاثر ہیں اور ایک طرح کی شرمندگی محسوس کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ بات بالکل واضح تھی، مگر پھر بھی وہ بار بار کہتے :-

"مجھے اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف احکام کی تعمیل کر رہا ہوں۔ کیا کروں؟ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔"

جواب میں اُن سے کہا گیا۔ کہ درخواست، خواہش، شکایت ان جذبات سے ہمارے دل بالکل خالی ہو چکے ہیں۔"

سپرنٹنڈنٹ نے یہ بھی کہا۔ کہ میں صرف یہی ایک صورت اپنے اطمینان کی دیکھتا ہوں کہ آپ کو اپنی جگہ دے دوں اور خود آپ کے ان کمروں میں چلا آؤں۔ مسٹر داس نے کہا۔ لیکن اگر میں سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا تو فوراً استعفا دے دوں گا۔"

معلوم ہوا ہے کہ ان کے متعلق حکّام جیل بلا چیف سیکرٹری گورنمنٹ بنگال

کے یہاں ٹیلی فون ہے، لیکن کوئی اطلاع ان کے یہاں نہیں دی گئی۔ اگر مقصود جیل کے کھانے سے تھا تو جس وارڈ میں وہ رکھے گئے وہاں کوئی انتظام کھانے کا نہ تھا۔

اس کے بعد وہ یوریپین وارڈ پہنچا دیے گئے۔ جہاں الگ الگ کمروں میں فوراً مقفل کر دیا گیا۔ کمروں پر گورکھا سپاہیوں کا پہرہ تھا۔

یہ وارڈ جیل کا بہتر حصہ سمجھا جاتا ہے اور یہاں صرف انڈر ٹرائل یوریپین قیدی رکھے جاتے ہیں۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ اوپر نیچے پانچ پانچ کمرے ہیں۔ ہر کمرہ دس فیٹ طول و عرض کا ہوگا۔ ہر کمرہ میں ایک صراحی، تام چینی کا کٹورا، اسٹول اور ایک ٹیبل ہوتا ہے۔ سونے کے لیے ٹاٹ کی گدیلی اور دو کالے کمبل ہوتے ہیں جو جیل میں مستعمل ہیں۔ تکیہ کی جگہ ٹاٹ کی ایک پتلی اور چھوٹی سی گدیلی سرہانے لگی ہوتی ہے۔

مولانا نے بعد کو بیان کیا:

"ہم لوگ تقریباً سات بجے اپنے اپنے کمروں میں بند کیے گئے۔ ساڑھے سات بجے میں نے دروازے کی سلاخوں سے آسمان کی طرف دیکھا تو عشاء کا وقت اچھی طرح آچکا تھا۔ میں نے عشاء کی نماز پڑھی۔ دو چار گھونٹ پانی کے پیئے اور لیٹ گیا۔ دو سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اس قدر جلد اور گہری نیند آ گئی۔ برسوں سے میری نیند بہت کمزور ہو گئی ہے۔ آجکل یہ حال تھا کہ گیارہ بجے لیٹتا تھا۔ ایک دو گھنٹے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد کہیں نیند آتی تھی۔ وہ بھی اس قدر کمزور کہ ذرا سی کھڑکھڑاہٹ خلل ڈال دیتی تھی۔ لیکن اس رات ساڑھے آٹھ بجے لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ تین بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلی۔ سنتری کے فوجی بوٹوں کی آواز سیمنٹ کے برآمدے میں بڑے زور سے ہو رہی تھی لیکن میری نیند میں ذرا بھی خلل نہ پڑا۔

نے مذاق کرتے ہوئے کہہ دیا کہ :-

"شاید میرے پریکٹس چھوڑنے کے بعد سے قانون بدل گیا ہے"

اس سے ایک گونہ پریشانی ہوئی۔ اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں کارروائی بالکل بے ضابطہ مشہور نہ ہو جائے۔ اس لیے مجبوراً تین بجے مسٹر اے زیڈ خاں فورتھ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کو پیش کار کے ساتھ جیل میں بھیج دیا گیا اور زیر دفعہ ۱-۲ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ وارنٹ بھی تیار کر لیے گئے۔
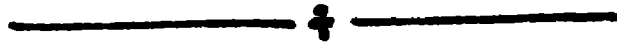
کے استصواب کے خود کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ آچکا ہے کہ ان لوگوں کو کسی شخص سے ملنے نہ دیا جائے۔ حتیٰ کہ عزیز و اقارب سے بھی۔ اخبارات کے دینے کی بھی قطعی ممانعت ہے۔

یورپین وارڈ کو "انگلش مین" ENGLISH MAN ——— دیا جاتا ہے۔
لیکن ان کے لیے وہ بھی ممنوع قرار پایا۔ کیونکہ باہر کی خبریں اس میں بھی درج ہوتی ہیں۔
بستر اور کھانا لے لیا گیا اور سپرنٹنڈنٹ نے تھوڑی دیر کے بعد اپنے آفس سے دو کرسیاں بھیج دیں۔

لاء اینڈ آرڈر "لاء اینڈ آرڈر" کی جیسی پابندی آجکل کی جا رہی ہے وہ ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے معاملہ میں بھی ابتدا ہی سے اس کی نمائش شروع ہو گئی۔ گرفتاری جمعہ کے دن سہ پہر کو ہوئی۔ اس دن کورٹ بند نہ تھا۔ وارنٹ لیا جا سکتا تھا۔ لیکن کوئی وارنٹ حاصل نہیں کیا گیا۔ گرفتاری کے بعد حسب قاعدہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا چاہیئے اور جب تک پیش نہ ہوں، پولیس کے چارج میں رہنا چاہیئے نہ کہ جیل میں۔ لیکن انہیں فوراً جیل میں بھیج دیا گیا۔ جیل میں ظاہر کیا گیا کہ آپ لوگ اس وقت تک گویا جیل میں نہیں ہیں پولیس کے چارج میں ہیں۔
لیکن بہر حال مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ناگزیر تھا۔ پیش کرنے کے لیے کورٹ میں لے جانا پڑتا اور اس میں پبلک کے مظاہرہ کا خدشہ تھا مجبوراً یہ تدبیر اختیار کی گئی۔ کہ چوتھے دن مسٹر کو ڈپٹی کمشنر پولیس کو بھیجا گیا اور کہا گیا کہ اس کی موجودگی مجسٹریٹ کی قائم مقامی کا حکم رکھتی ہے۔ خیال یہ تھا کہ نان کو اپریشن کی وجہ سے کسی طرح کا قانونی اعتراض تو کیا نہیں جائے گا۔ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے اور مقدمہ کی تاریخ مقرر کرنے کی مشکل سے نجات مل جائے گی۔ لیکن مسٹر داس نے

کے لیے تو حسب قاعدہ پوچھ لیجئے مجسٹریٹ صاحب کو بھی یاد آگیا کہ واقعی ملزموں کو ضمانت دینے کا بھی حق ہوا کرتا ہے۔ لیکن انہوں نے کہا۔ یہ حضرات ضمانت نہیں دیں گے۔ اس لیے میں نے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔

آخر میں مسٹر خاں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔ کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے، ان سے یہاں آنے کے لیے کہا گیا وہ چلے آئے۔

۲۳ر تاریخ کے تعین میں یہ مصلحت تھی۔ کہ ۲۴ر سے کرسمس کی تعطیل تھی ۲۳ر کو جب مقدمہ ملتوی کر دیا جائے گا تو تعطیل کی وجہ سے ایک ہفتہ خود بخود مہلت نکل آئے گی۔

پہلی پیشی

۱۳۔ دسمبر

یہ گویا پہلی پیشی تھی۔ ملزموں کو عدالت کے سامنے نہ جانا پڑا۔ خود عدالت ملزموں کے دروازے پر آ گئی۔ ان کے کمروں کے سامنے جو برآمدہ ہے اسی میں وارڈ (محافظِ وارڈ) کا ٹوٹا ہوا میز بچھایا گیا۔ اسی کی ٹوٹی ہوئی کرسی مجسٹریٹ کے لیے رکھی گئی۔ سامنے ملزموں کے لیے اسٹول تھے۔ اس سازوسامان کے ساتھ عدالت کا اجلاس شروع ہوا۔

لیکن کارروائی نہایت ہی مختصر تھی اور مجسٹریٹ صاحب کی مضطربانہ عجلت اور زیادہ اختصار کا باعث ہوئی۔ انہوں نے کہا:

دفعہ ۱۷ کے تحت آپ لوگ گرفتار کیے گئے ہیں۔ مقدمہ کی تاریخ ۲۳۔ دسمبر قرار دی جاتی ہے۔

یہ کہہ کر جلدی سے انہوں نے وارنٹ پر مہر لگانے کے لیے کہا اور اٹھنے لگے لیکن بے چارہ پیشکار زیادہ ہوشمند ثابت ہوا۔ اس نے کہا کہ ضمانت

۵ر جنوری

۵ر جنوری کی پیشی کی کارروائی یہ ہے کہ کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ دس بجے مسٹر سی۔ آر۔ داس کو پریذیڈنسی کورٹ جانے کے لیے طلب کیا گیا، لیکن مولانا کی طلبی نہیں ہوئی۔

بعد کو معلوم ہوا کہ گو ابتداء میں مسٹر داس اور ان کی پیشی کے لیے ایک ہی تاریخ قرار دے دی گئی تھی۔ لیکن پھر کسی مصلحت سے مولانا کا مقدمہ ایک دن پیچھے ڈال دیا گیا۔ عدالت کے قوانین کی رو سے ضروری تھا۔ کہ یہ التوا بھی عدالت کے حکم و تصدیق سے ہوتا۔ یعنی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جاتا اور پھر کارروائی دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دی جاتی، لیکن موجودہ عہد قانون و نظم (لا اینڈ آرڈر) میں ان پابندیوں کے درد سر سے بھی عدالتوں کو نجات مل گئی ہے۔ نہ ملزمان کوا پرٹیو ڈیفینس کریں گے، نہ بچنا چاہیں گے۔ پھر قواعد و ضوابط کی پابندی سے کیا حاصل؟

۶ر کی کارروائی سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ نے دفعہ ۱۷-۲۔ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ واپس لے لیا اور کارروائی از سر نو دفعہ ۱۲۴-الف پینل کوڈ کے تحت

دُوسری پیشی

۲۳ر دسمبر

۲۳ر کو چار بجے پھر مسٹر اے۔ زیڈ خاں بھیجے گئے۔ لیکن اس مرتبہ سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں عدالت کا اجلاس ہوُا۔ میز کے سامنے ملزموں کے لیے بھی کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ لیکن کارروائی کے اختصار کی وجہ سے بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی۔ کارروائی صرف اس قدر ہوئی، کہ مقدمہ ۵ جنوری تک ملتوی کر دیا گیا۔ مجسٹریٹ نے اپنی لاعلمی اور بے تعلقی کا بار بار اظہار کیا۔
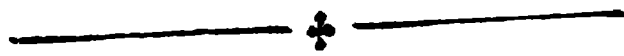
تیسری پیشی

۶ر تاریخ کو ساڑھے بارہ بجے مولانا کا مقدمہ مسٹر سونیہو چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہُوا۔

کارروائی شروع ہونے سے پیشتر ہی عدالت کا کمرہ مشتاقانِ زیارت سے پُر ہوچکا تھا۔ جس میں ہر قوم کے اشخاص مسلمان، ہندو، مارواڑی وغیرہ موجود تھے۔

احاطہ عدالت اور سڑک پر بھی ایک جمِ غفیر موجود تھا اور لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔

جس وقت مولانا کٹہرے میں لائے گئے۔ تمام حاضرین معہ وکلاء تعظیم کے لیے سروقد کھڑے ہوگئے۔

مولانا نے سب کے سلام کا جواب نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ دیا اس کے بعد مولانا کٹہرے میں اس انداز سے کھڑے ہوتے کہ آپ کا ایک ہاتھ کٹہرے پر تھا اور ہتھیلی پر سر تھا۔ چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی اور نہایت ہی بے پروائی کے ساتھ اپنے اردگرد کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

شروع ہوئی۔ گرفتاری کے بعد جو وارنٹ حاصل کیا گیا تھا وہ دفعہ ۱۷-۲ کا تھا اس لیے ۱۲۴ کا مقدمہ شروع نہیں ہو سکتا۔ جب تک از سر نو ۱۲۴ کے ماتحت وارنٹ سرو نہ کیا جائے اور اس کی گرفتاری کا نفاذ نہ ہو، لیکن پچھلے لطیفہ سے بھی بڑھ کر لطیفہ یہ ہے۔ کہ ۱۲۴-الف کے ماتحت کوئی ضابطہ کی کاروائی عمل میں نہیں آئی۔ نہ تو اس کا وارنٹ سرو کیا گیا۔ نہ ضابطہ کی گرفتاری ہی کا نفاذ ہوا۔ تاہم ۶ر کو مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر سی آئی ڈی نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا کہ:-

"اس نے پریذیڈنسی جیل میں وارنٹ سرو کیا"

مولانا اپنے بیان میں لکھتے ہیں۔ یہ معاملہ بے قاعدگی اور کذب بیانی کا انتہائی نمونہ ہے۔ ۶ر تاریخ تک تو مجھے اس کا علم بھی نہ تھا۔ کہ ۱۲۴- کے ماتحت دعویٰ کیا جائے گا؟ وارنٹ کے نفاذ سے کیا تعلق؟ نہ تو جیل میں کوئی شخص اس غرض سے آیا۔ نہ مجھ پر وارنٹ سرو کیا گیا۔

پس گویا ۵ر جنوری سے مولانا از روئے قانون بالکل آزاد تھے۔ ان کی گرفتاری شام کے بعد کوئی وجود نہ رکھتی تھی۔ اگر وہ جیل کے افسروں پر سر جانے کی نالش کر دیں کہ کیوں انہیں ۵ر کے بعد جیل میں مقیّد رکھا گیا؟ تو وہ کیا جواب دیں گے؟ البتہ یہ سب کچھ اسی صورت میں ہے۔ جبکہ "از روئے قانون" کے کوئی معنی ہوں۔ لیکن دراصل اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

غرضیکہ بجائے ۵ر کے ۶ر جنوری کو ساڑھے گیارہ بجے مولانا پریذیڈنسی کورٹ میں لائے گئے اور اسی پیشی سے کارروائی شروع ہوئی۔ مولانا جیل کی بند موٹر لاری میں لائے گئے تھے مسلح فوجی پولیس کا کپتان محافظ تھا۔

سزایابی پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے موجودہ وقت میں خلافت کے متعلق لوگوں کو ان کا فرض بتایا۔ یہ تقریریں اردو شارٹ ہینڈ میں لی گئی تھیں۔ اس کے بعد انہیں صاف کر کے انگریزی ترجمہ کرایا گیا۔ یہ ترجمہ ابھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میں نے خود یہ تقریریں پڑھی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تقریریں دفعہ ۱۲۴ کے ماتحت آتی ہیں۔ لیکن خیر یہ تو میری رائے ہے۔"

"میں ان تقریروں کا انگریزی ترجمہ پڑھتا ہوں۔ فیصلہ یور آنر پر منحصر ہے کہ آیا اس دفعہ کے ماتحت آتی ہیں یا نہیں۔ مزید برآں میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ نے زیر دفعہ ۱۹۶ تعزیرات ہند، اس مقدمہ کے لیے سینکشن دے دیا ہے اور اس کے اثبات کے لیے میں سب سے پہلے مسٹر گولڈی کو پیش کرتا ہوں۔"

مسٹر گولڈی: اس کے بعد مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر اسپیشل برانچ شہادت کے لیے بلائے گئے۔ سرکاری وکیل نے دریافت کیا: "کیا ملزم کو گرفتار کرنے کے لیے تمہیں گورنمنٹ آف بنگال سے کوئی اختیار دیا گیا تھا؟"

جواب: "ہاں۔"

سوال: "کیا انہی تقریروں کے لیے؟ یہ کن تاریخوں میں کی گئی تھیں؟"

جواب: "ہاں۔ یکم اور ۱۵ جولائی ۱۹۲۱ء کو۔"

سوال: "کیا یہی سینکشن تمہیں ملا تھا؟"

جواب: "ہاں۔"

کارروائی شروع کرتے ہوئے رائے بہادر تارک ناتھ سادھو سرکاری وکیل نے بیان کیا:-

"مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف دو مقدمے ہیں۔ ایک دفعہ ۱۷-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کے ماتحت۔ دوسرا زیر دفعہ ۱۲۴- الف تعزیرات ہند (بغاوت) چونکہ مؤخر الذکر جرم نہایت ہی سنگین ہے۔ لہٰذا میں ان کے خلاف قانون ترمیم شدہ ضابطہ فوجداری کے ماتحت کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا اور اپنے اس دعویٰ کو واپس لیتا ہوں۔ مولانا اس دفعہ کے ماتحت آزاد ہیں۔"

مجسٹریٹ (مولانا کو مخاطب کر کے) "آپ رہا کر دیے گئے۔"

کورٹ انسپکٹر نے مجسٹریٹ کو بتایا۔ کہ مولانا انگریزی نہیں جانتے۔

مولانا: "میں کچھ نہیں سمجھتا اور مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

لیکن مجسٹریٹ نے ایک اردو مترجم کو بلوایا۔ بابو بی سی چیٹرجی کے سپرد یہ خدمت ہوئی۔ سرکاری وکیل نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ملزم کے خلاف موجودہ مقدمہ زیر دفعہ ۱۲۴- الف تعزیرات ہند ہے۔ یہ اُن دو تقریروں کی بنا پر ہے جو انہوں نے پہلی اور ۱۵ر جولائی ۱۹۲۱ء کو مرزا پارک کلکتہ میں کی تھیں۔ پہلے جلسہ کا مقصد تین اشخاص حکیم سعید الرحمٰن، جگدمبا پرشاد اور اجودھیا پرشاد کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا۔ اس کے بعد ۱۵ر جولائی کو ملزم نے اسی جگہ ایک دوسری تقریر کی۔ اس میں مذکورہ بالا اشخاص کی

ابُوالليث مُحمّد

اس کے بعد سرکاری شارٹ ہینڈ رپورٹر ابوالليث محمد پیش ہوا۔ اس نے بیان کیا:

"میں گورنمنٹ آف بنگال کا شارٹ ہینڈ رپورٹر ہوں۔"

یہاں مجسٹریٹ نے مولانا کو مخاطب کر کے کہا:

"کیا آپ چاہتے ہیں۔ کہ آپ کے لیے گواہی کا ترجمہ کرایا جائے؟"

جواب میں مولانا نے فرمایا:

"مجھے کسی ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر عدالت کو ضرورت ہو تو وہ خود ایسا کر سکتی ہے۔"

مجسٹریٹ: "تو کیا آپ انگریزی سمجھتے ہیں؟"

مولانا: نہیں۔"

گواہ نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کلکتہ یونی ورسٹی کا تعلیم یافتہ ہوں۔ تقریباً ۱۸ مہینے تک لکھنؤ کرسچین کالج میں رہ چکا ہوں۔ وہاں میں نے اردو مختصر نویسی میں ایک آنرز سرٹیفکیٹ اور سند حاصل کی۔"

"۱۶۰ حرف فی منٹ میری رفتار ہے۔ میں اردو سمجھتا ہوں۔ اردو مختصر نویسی میں نے لکھنؤ میں سیکھی ہے۔"

"یکم جولائی مجھے یاد ہے۔ اس روز میں مرزا پور پارک کے ایک جلسہ

سوال: کیا اسی کے ذریعہ سے تمہیں مولانا ابوالکلام آزاد کو گرفتار کرنے کے لیے حکم دیا گیا تھا؟

جواب: "ہاں"۔

سوال: "کیا اس پہ گورنمنٹ آف بنگال کے چیف سیکریٹری کا دستخط ثبت ہے"؟

جواب: "ہاں میں ان کے دستخط پہچانتا ہوں"۔

سوال: "سینکشن کس تاریخ کو دیا گیا تھا؟"

جواب: "۲۴ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو"۔

سوال: "کیا سینکشن ملنے کے بعد تم نے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی خدمت میں کوئی درخواست پیش کی تھی؟"

جواب: "ہاں"

سوال: "تو پھر کیا تمہیں کوئی وارنٹ ملا؟"

جواب: "ہاں میں نے پریذیڈنسی جیل میں سرو کیا"۔

سوال: "عام طور پہ جب تمہیں کسی جلسہ کی اطلاع ملتی ہے تو کیا تم کوئی رپورٹر وہاں بھیجتے ہو؟"

جواب: "ہاں"۔

سوال: "کیا یہی وہ رپورٹ اور اس کی نقل ہے جو تمہیں دکھائی گئی تھی؟"

جواب: "ہاں"

سرکاری وکیل: جلسہ کس غرض سے ہوا تھا؟

گواہ: "مبلغین خلافت حکیم سعید الرحمٰن، جگدمبا پرشاد اور اجودھیا پرشاد کی گرفتاری کے متعلق۔"

"جلسہ میں تقریباً" بارہ ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہر قسم کے لوگ جلسہ میں موجود تھے، لیکن ۵۰ فیصد مسلمان تھے۔ میں نے صحیح نوٹ لیے تھے۔ انسپکٹر کے۔ ایس گھوسال اور دوسرے میرے ہمراہ تھے اور یہ (مولانا ابوالکلام آزاد) صدرِ جلسہ کی تقریر کا نوٹ ہے۔ اس کے بعد بابو پنچکوری بنرجی نے تقریر کی تھی۔"

"بابو پنچکوری بنرجی کی تقریر صدرِ جلسہ کی تقریر کے ساتھ شامل ہے۔"

"۵ ار جولائی کو بھی مرزا پور پارک میں متعین کیا گیا تھا۔ میں وہاں گیا تھا۔ میں نے وہاں کی تقریروں کے نوٹ لیے۔ انسپکٹر مکرجی اور مسٹر کر بھی میرے ہمراہ تھے۔ مولوی نجم الدین اور ملزم نے اس جلسہ میں تقریر کی تھی۔ میں نے ان تقریروں کا نوٹ لانگ ہینڈ میں لیا۔ میں نے تقریر کے صرف انہی حصوں کا صحیح نوٹ لیا۔ جنہیں میں نے ضروری سمجھا۔"

"میں کلکتہ یونی ورسٹی کا تعلیم یافتہ اور بی۔ ایس۔ سی ہوں میں اردو سمجھتا ہوں۔ تقریباً دس اور بارہ ہزار کے درمیان جلسہ میں لوگوں کا مجمع تھا۔"

یہاں سرکاری وکیل نے گواہ سے کہا:۔

"نوٹ دیکھ کر ذرا اپنے حافظہ کو درست کر و۔" گواہ نے دیکھ کر بتایا۔

میں مقرر ہوا تھا۔ اردو میں وہاں جو تقریریں ہوئیں۔ ان کے میں نے نوٹ لیے تھے۔ ملزم نے وہاں اردو میں تقریر کی تھی اور وہی اس جلسہ کے صدر تھے۔"

"حتی الامکان میں نے بہتر نوٹ لیے اور حسب معمول مسٹر گولڈی کمشنر کے پاس بھیج دیا۔ مسٹر گولڈی نے اس پہ ۲۵ تاریخ کو دستخط کیا۔ اس کے بعد میں نے اسی تقریر کی نقل اردو لانگ ہینڈ میں لی اور مسٹر گولڈی کے سامنے پیش کیا۔"

"اس پہ مسٹر گولڈی کا ۴ ادسمبر ۱۹۲۱ء کا دستخط موجود ہے۔"

اس کے بعد باماچرن چیٹرجی سرکاری مترجم پیش ہوا۔ اس نے بیان کیا وہ اردو اور ہندی کا مترجم ہے اور الہ آباد یونی ورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے۔

سرکاری وکیل: "پہلی جولائی کی اردو تقریر کو ذرا دیکھو۔"

گواہ: "میں نے ہی اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس پہ میرا دستخط موجود ہے۔ میں نے حتیٰ الامکان اس کا بہتر ترجمہ کیا۔"

سرکاری وکیل: دوسری تقریر کو دیکھو جو ۱۵ جولائی کی ہے۔"

گواہ: میں نے اس کا بھی صحیح ترجمہ کیا ہے۔"

اس کے بعد محمد اسمٰعیل انسپکٹر اسپیشل برانچ بلوایا گیا۔ اس نے بیان کیا۔ میں مرزا پور پارک میں متعین کیا گیا تھا۔ وہاں میں نے ملزم کو دیکھا۔ انہوں نے وہاں ایک تقریر کی تھی۔ میں نے اردو لانگ ہینڈ میں پہلی جولائی کا نوٹ لیا تھا۔ ملزم اس جلسہ کے صدر تھے اور اسی حیثیت سے تقریر کی تھی۔"

مقرر ہُوا تھا میں نے نوٹ لیے اور ۱۵ر جولائی ۱۹۲۱ء کو ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں پیش کر دیے۔"

"ملزم اس جلسہ کے صدر تھے۔ انہوں نے وہاں ایک تقریر کی تھی۔ میں نے اس کے صحیح نوٹ لیے تھے۔ یہ نوٹ اسی روز شام کو مسٹر گولڈی کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ اس پر ان کا دستخط موجود ہے۔ محمد اسمٰعیل اور میں دونوں نے ایک مشترکہ نوٹ داخل کیا تھا۔ ملزم نے اردو میں تقریر کی تھی۔ میں کچھ کچھ اس زبان کو سمجھتا ہوں۔"

"یہ جلسہ تین مبلغینِ خلافت حکیم سعید الرحمٰن۔ جگدمبا پرشاد اور اجودھیا پرشاد کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے اور لوگوں کو جیل جانے کی ترغیب دینے اور شوق دلانے کی غرض سے ہُوا تھا۔"

"تقریباً دس ہزار کا مجمع تھا۔ مسلمان، ہندو اور ہوڑا اور للوا کے ملّوں کے بہت سے مزدور اس میں شریک تھے۔ تقریباً ۵۰ والنٹیر بیج لگائے ہوئے تھے۔ جس پر یہ لکھا تھا: جیل جانے کے لیے تیار ہیں۔"

مسٹر گولڈی پھر بلوائے گئے۔ انہوں نے رپورٹ اور نوٹ پر جو وہاں پیش کیے گئے تھے، اپنے دستخط ہونے کی تصدیق کی۔

اس کے بعد سرکاری وکیل نے پہلی جولائی کی تقریر کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سنایا اور کہا:

"دس ہزار کا مجمع تھا ہم نے ایک مشترکہ نوٹ داخل کیا تھا۔"

اس کے بعد کے۔ایس گھوسال انسپکٹر اسپیشل برانچ کی شہادت لی گئی اس نے بیان کیا:۔

"میں کلکتہ یونیورسٹی کا گریجوایٹ ہوں۔یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو مرزا پور اسکوئر کے جلسہ میں گیا تھا۔ ملزم اس جلسہ کے صدر تھے میں نے تقریروں کے نوٹ لانگ ہینڈ میں لیے تھے۔میں تقریر کے صرف انہی حصوں کا نوٹ لیا کرتا ہوں جنہیں میں ضروری سمجھتا ہوں۔میں نے ان کے صحیح نوٹ لیے تھے (نوٹ پیش کرتے ہوئے) یہ پہلی جولائی کی مختصر رپورٹ ہے۔اس میں صدر (ملزم) کی تقریر بھی شامل ہے۔یہ نوٹ مسٹر گولڈی کی خدمت میں پیش کر دیے تھے جن پر انہوں نے اپنا دستخط کر دیا تھا۔

سرکاری وکیل: "جلسہ کس غرض سے ہوا تھا؟"

جواب: سعید الرحمٰن، جگدمبا پرشاد اور راجو دھیا پرشاد کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے۔تقریباً ۱۲ ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ہر قسم کے لوگ اس میں شریک تھے۔لیکن نصف کے قریب ہندوستانی مسلمان تھے۔ بقیہ نصف ہندوستانی ہندو اور بنگالی تھے۔"

اس کے بعد بی۔بی مکرجی انسپکٹر سی۔آئی۔ڈی پیش ہوا۔اس نے بیان کیا:۔

"مرزا پور پارک کے ایک جلسہ میں نوٹ لینے کے لیے میں

مجسٹریٹ "کیا آپ کوئی گواہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟"

مولانا "نہیں۔ اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو آخر میں اپنا تحریری بیان پیش کر دوں گا۔"

مجسٹریٹ "کیا آپ کو کاغذ کی ضرورت ہے؟"

مولانا "نہیں"

مجسٹریٹ "کیا آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟"

مولانا "میں اپنی تقریروں کی نقل چاہتا ہوں (جو انہیں دے دی گئی)

یہاں سرکاری وکیل نے مجسٹریٹ سے درخواست کی۔ کہ عرضی دعویٰ کی بھی ایک نقل ملزم کو دی جائے۔

اس کے بعد مقدمہ ۱۱ر جنوری تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا، مقدمہ کے دوران میں عدالت کے احاطہ اور سڑک پر عظیم الشان مظاہرہ جاری تھا۔ قومی نعروں کی آوازیں برابر بلند ہو رہی تھیں۔ جونہی مولانا جیل کی گاڑی میں سوار ہونے لگے، ابوالکلام آزاد کی جے، بندے ماترم، مہاتما گاندھی کی جے، ہندو مسلمانوں کی جے اور اللہ اکبر کے پرشکوہ نعروں سے تمام فضا گونج اٹھی۔

لوگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ کچھ عرصہ تک گاڑیوں کی آمد و رفت بھی رک گئی تھی۔

"۱۵ جولائی کو بھی اسی قسم کی تقریر ہوئی تھی۔"

پھر اس نے چارج شیٹ مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد لنچ کے لیے کارروائی ملتوی کر دی گئی۔

لنچ کے بعد کی کارروائی

۲ بج کر ۲۰ منٹ پر مجسٹریٹ عدالت میں داخل ہوا۔ مولانا کو بلوایا گیا جس وقت مولانا صحن سے ہو کر عدالت کے کمرہ میں لائے جا رہے تھے۔ تو باہر کے عظیم الشان مجمع نے جو سڑک پر کھڑا تھا۔ مولانا کی ایک ذرا سی جھلک دیکھ پائی اور اللہ اکبر کی گونج سے در و دیوار ہلنے لگے۔

جب مولانا کمرے میں داخل ہوئے تو تمام حاضرین سرو قد اٹھ کھڑے ہوئے اور بلا قصد ان کی زبان سے بھی اللہ اکبر کا نعرہ نکل گیا۔ اگرچہ خود مولانا ہاتھ کے اشارے سے روکتے رہے۔ مجسٹریٹ نے گھبرا کر فوراً سارجنٹ کو کمرہ خالی کرا دینے کا حکم دیا۔ جس پر فوراً عمل کیا گیا۔ صرف چند آدمی جو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اندر رہ گئے۔

شارٹ ہینڈ اردو رپورٹر نے ان دونوں تقریروں کو جن کی بنا پر دعویٰ کیا گیا ہے۔ پڑھ کر سنایا۔

اس کے بعد ۱۲۴- الف کے ماتحت فرد قرار داد جرم لگا دی گئی۔

مجسٹریٹ (مولانا سے) کیا آپ کچھ چاہتے ہیں؟

مولانا: نہیں۔

اس پر انگریزی حرف "بی" کا نشان ہے:

۲- پھر ۱۵ جولائی ۱۹۲۱ء کو ملزم مذکور نے اردو میں ایک دوسری تقریر اسی جگہ پر اور اسی مضمون پر کی اور ایک اردو رپورٹر نے ان کی پوری تقریر کا اردو شارٹ ہینڈ میں نوٹ لیا۔ اس نوٹ کی ایک نقل جس پر حرف "سی" کا نشان ہے منسلک ہے۔ اور دوسرا کاغذ جس پر حرف "ڈی" کا نشان ہے۔ مذکورہ بالا شارٹ ہینڈ کا انگریزی ترجمہ ہے جسے گورنمنٹ بنگال کے ایک بنگالی مترجم نے کیا ہے۔

۳- دونوں موقعوں پر اسپیشل برانچ کے تین اور افسروں نے بھی لانگ ہینڈ میں نوٹ لیے تھے۔ اور وہ اس شارٹ ہینڈ رپورٹ کی تصدیق کرتے ہیں۔

۴- تقریروں کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مقرر نے اپنی ان تقریروں سے گورنمنٹ قائم شدہ بروئے قانون کے خلاف لوگوں میں حقارت و نفرت پھیلانے کی کوشش کی اور اس طرح ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا جس کی وجہ سے ۱۲۴- الف تعزیرات ہند کے ماتحت سزا کا مستوجب قرار پا سکتا ہے۔

۵- گورنر ان کونسل نے مدعی کو یہ حکم اور اختیار دیا ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو مذکورہ بالا جرم کی بنا پر زیر دفعہ ۱۲۴- الف تعزیرات ہند گرفتار کرے اور ان کے خلاف چارہ جوئی کرے۔ سینکشن کی اصل کاپی منسلک ہے۔ اور اس پر حرف "ای" کا نشان ہے۔ لہذا مدعی یہ درخواست کرتا ہے کہ ملزم

نقلِ استغاثہ

مولانا ابوالکلام آزاد — مدعا علیہ

بعدالت چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ

برائے گرفتاری زیر دفعہ ۱۲۴-الف تعزیرات ہند

مدعی: جے - ایم - گولڈی - ڈپٹی کمشنر آف پولیس - اسپیشل برانچ کلکتہ

مذکورہ بالا مدعی کا بیان حسب ذیل ہے :-

۱- یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو مدعا علیہ نے مرزا پارک میں نان کوآپریشن اور بائیکاٹ کے مضمون پر اردو میں ایک تقریر کی تھی۔

ایک اردو مختصر نویس نے ان کی پوری تقریر کے نوٹ اردو میں لیے۔ مذکورہ بالا نوٹ کی نقل کی ایک اردو کاپی جس پر انگریزی حرف "اے" کا نشان بنا ہے منسلک درخواست ہذا ہے۔ مذکورہ بالا شارٹ ہینڈ نوٹ کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے جسے گورنمنٹ آف بنگال کے ایک بنگالی مترجم نے کیا ہے

چوتھی پیشی

۱۱ تاریخ کو مسٹر سوینہو چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں چوتھی پیشی ہوئی۔ حسب معمول کمرہ اور احاطۂ عدالت لوگوں سے پُر تھا لیکن قبل اس کے کہ کارروائی شروع ہو۔ سارجنٹ نے کمرہ لوگوں سے خالی کرا لیا۔ حتّٰی کہ ان لوگوں کو بھی نہ رہنے دیا جو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کے بعد مولانا لائے گئے۔ جونہی انہوں نے کٹہرے میں قدم رکھا۔ تمام وکلاء جو وہاں موجود تھے۔ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مجسٹریٹ نے مولانا سے دریافت کیا:

کیا آپ کوئی بیان دینا چاہتے ہیں؟

مولانا: "ہاں"۔

"اگر عدالت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ایک تحریری بیان پیش کروں گا۔"

مجسٹریٹ: کیا وہ آپ کے ساتھ ہے؟

مولانا: ہاں! یہ اردو میں ہے لیکن میں چاہتا ہوں، اس کا انگریزی ترجمہ عدالت

کے خلاف حکم نامہ جاری کیا جائے کہ وہ مذکورہ بالا الزامات کی جواب دہی کرے اور اس کے حاضر ہونے پر مقدمہ چلایا جائے۔ نیز قانون کے مطابق کارروائی عمل میں لائی جائے۔

پانچویں پیشی

۱۷ جنوری کو مولانا کے مقدمہ کی سماعت پریذیڈنسی سول جیل میں ہوئی حسب معمول ہزاروں آدمی وقت مقررہ پر پریذیڈنسی کورٹ پہنچ گئے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا۔ کہ مقدمہ کورٹ کے بجائے جیل میں ہوگا۔ تو اپنے اپنے گھروں کو مایوس واپس ہو گئے۔ پھر بھی ایک معقول تعداد ہندو مسلمانوں کی فوراً ٹیکسیوں میں سوار ہو کر جیل پہنچ گئی۔ مگر وہاں انہیں احاطۂ جیل کے اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ مولانا کے اعزاء اور اخبارات کے نمائندوں کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ عدالت کے اندر صرف مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر اسپیشل برانچ اور چند سی آئی ڈی پولیس افسر موجود تھے۔ ۱۲ بجے مسٹر سوینہو چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ بمعیت رائے بہادر تارک ناتھ سادھو سرکاری وکیل آئے۔

اخبارات کے نمائندوں نے اندر جانے کی پھر کوشش کی۔ لیکن عدالت کے پیش کار نے کہا۔ حکام جیل سے اس کی درخواست کرنی چاہیئے۔ وہی اس کی اجازت

میں داخل کردوں"

مجسٹریٹ: "توکیا آپ خود اس کا ترجمہ کرالیں گے؟"

مولانا: "ہاں - اگر عدالت کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہو"۔

مجسٹریٹ: "کیا آپ کو اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

مولانا: "اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میں اپنی اس تقریر کا جسے باغیانہ بتایا گیا ہے۔ انگریزی ترجمہ دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"مجسٹریٹ: کیا بیان کے لیے اس کی ضرورت ہے؟"

مولانا: "میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

مجسٹریٹ نے عدالت سے دریافت کیا کہ انگریزی ترجمہ ان کو پہلے ہی کیوں دیا گیا؟ اب انہیں فوراً دے دیا جائے۔ سرکاری وکیل نے ایک پولیس افسر سے کہا۔ اس نے بیان کیا اس وقت وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ جیل میں بھیج دیا جائے گا۔

اس کے بعد مقدمہ ۱۰ جنوری ۱۹۲۲ء تک ملتوی کر دیا گیا۔

سابق کی طرح آج بھی ایک بہت بڑا مجمع سڑک پر موجود تھا اور برابر قومی نعرے لگا رہا تھا۔

کی وجہ سے انگریزی ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔

مجسٹریٹ ": تو کیا آپ اس کے ترجمہ کے لیے اور مہلت چاہتے ہیں؟"

مولانا ": نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ محض ترجمہ کے لیے مقدمہ میں تاخیر ہو۔"

مجسٹریٹ : لیکن اگر اس کا انگریزی ترجمہ ہو جاتا تو عدالت کے لیے اس میں آسانی ہو جاتی۔"

اس کے بعد مقدمہ ۹ا تاریخ تک ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن بعد کو خود بخود ۹ا کے بجائے ۲۴ تاریخ کر دی گئی۔

دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل میں جیلر سے کہا گیا۔ اس نے کہا۔ وہ کمرہ اب عدالت کو دے دیا ہے۔ ان کا اس میں کوئی اختیار باقی نہیں۔ چنانچہ مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ لیکن جواب ملا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس درخواست دی جائے۔ سپرنٹنڈنٹ اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن بعد میں سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے کہا۔ کہ نہ تو اس کی طرف سے روک تھی اور نہ وہ روکنے کا مجاز تھا۔ اس کا اختیار تو صرف مجسٹریٹ کو ہے۔

ٹھیک پونے بارہ بجے جیلر کے ہمراہ مولانا آئے۔ مولانا نے کمرۂ عدالت میں قدم رکھتے ہی دریافت کیا: "یہ کارروائی پبلک ہے یا پرائیویٹ ؟

مجسٹریٹ: "پرائیویٹ!"

مجسٹریٹ: "آپ تشریف رکھیں۔"

مولانا: "کیا آپ نے یہ مجھ سے کہا ہے! غالباً آپ کو یاد نہیں رہا۔ کہ پہلے بھی میں دو مرتبہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہوں۔"

مجسٹریٹ: "مجھے یاد ہے!"

مولانا: "گزشتہ موقعوں پر جب میں دو تین گھنٹے تک مسلسل کھڑا رہ سکا۔ تو آج بھی کھڑے رہنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی!

مجسٹریٹ: افسوس ہے کہ مجھے ایسے موقعوں پر یاد نہ رہا۔

مولانا: "آپ کے اس اعتراف کا شکریہ۔"

مجسٹریٹ: "کیا آپ اپنا بیان لائے ہیں؟"

مولانا نے اپنا اردو بیان پیش کر دیا اور کہا کہ ان کے سیکرٹری کی عدم موجودگی

ساتویں پیشی

مولانا کی طبیعت کئی دن سے سخت علیل تھی۔ جگر کا فعل ناقص ہونے
کی وجہ سے اسہال کی شکایت لاحق ہو گئی۔ ۲۱ کو ایک مرتبہ استفراغ بھی ہوا۔
جیل کے ڈاکٹر نے کہا۔ ایسی حالت میں ان کا عدالت میں جانا نہایت مضر ہوگا۔
سپرنٹنڈنٹ تیار ہے کہ عدالت کو اطلاع دے کہ پیشی ملتوی کرادی جائے لیکن
لیکن مولانا نے پسند نہ کیا کہ ان کی وجہ سے کارروائی میں کسی طرح کا التوا یا تاخیر
ہو۔ انہوں نے کہا۔ جب کارروائی جیل ہی کے احاطہ میں ہوتی ہے تو تھوڑی دیر
کے لیے چند قدم چلا جانا کچھ دشوار نہ ہوگا۔ جیل سے کوئی اطلاع عدالت کو نہ
دی جائے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر سونیہو پریذیڈنسی مجسٹریٹ
کی لے کر آئے جو مہر کی لکھی ہوئی تھی اور اس میں لکھا تھا۔ کہ مولانا کا مقدمہ
۹ فروری پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔

چھٹی پیشی

۲۴ر جنوری

۲۴ر جنوری کو مولانا کا مقدمہ سول جیل میں چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ آج خلافِ معمول پبلک کی ایک معقول تعداد کو جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

ایک بجے کے قریب مولانا تشریف لائے اور صرف یہ کارروائی ہوئی کہ مولانا کا بیان عدالت نے لے لیا اور ۳۱ر جنوری آئندہ پیشی کے لیے تاریخ پائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد

کا

تحریری بیان

۵ جنوری کے کارروائی کے مقابلے میں یہ کارروائی غنیمت تھی یکم از کم اطلاع تو دے دی گئی مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی چٹھی مجسٹریٹ کی موجودگی اور ملزم کی حاضری کے قائم مقام ہو سکتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو یہ گویا قوانین مسلّمہ عدالت میں ایک نئے قاعدہ کا اضافہ ہو گا۔ ہم اسے "ترمیم" بھی کہہ سکتے تھے مگر جہاں تک معلوم ہے۔ ۱۹۰۸ء میں صرف ضابطۂ فوجداری ہی کی "ترمیم" ہوئی تھی۔ ضابطۂ عدالت کی نہیں ہوئی تھی۔

اب ہم پہلے مولانا کا بیان درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد آخری پیشی کی روداد اور عدالت کا فیصلہ نقل کریں گے۔

بر بدمستی سنہ دگر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ پارینہ ام پیمانہ بردارد

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَحدَہٗ

میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے نہ طلب ہے نہ شکایت ہے یہ ایک موڑ ہے جس کو گزرے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف دم لے لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کہ کوئی نان کوا پریٹر کسی طرح کا بھی حصہ عدالت کی کارروائی میں نہ لے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی، سنٹرل خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماءِ ہند نے اگرچہ اس کی اجازت دے دی ہے کہ پبلک کی واقفیت کے لیے تحریری بیان دیا جا سکتا ہے لیکن ذاتی طور پر میں لوگوں کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ خاموشی کو ترجیح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس لیے بیان دیتا ہے کہ مجرم نہیں۔ اگرچہ اس کا مقصد پبلک کی واقفیت

کرنا پسند نہ کرتی ہو۔

میں یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ "نان کواپریشن" کا خطاب صرف گورنمنٹ، گورنمنٹ کے سسٹم اور موجودہ حکومتی اور قومی اصولوں سے ہے، افراد و اشخاص سے نہیں ہے۔

عدالت گاہ ناانصافی کا قدیم ترین ذریعہ ہے

ہمارے اس دور کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں۔ تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی، دونوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں یہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیانِ مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک، کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہدِ قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوف ناک رومی عدالتیں اور ازمنۂ متوسط (مڈل ایجز) کی پُراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کہ جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے

ہو۔ تاہم وہ اشتباہ سے محفوظ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچاؤ کی ایک ہلکی سی خواہش اور سماعتِ حق کی ایک کمزور سی توقع اس کے اندر کام کر رہی ہو حالانکہ نان کواپریشن کی راہ بالکل قطعی اور یک سُو ہے۔ وہ اس بارے میں اشتباہ بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

"نان کواپریشن" موجودہ حالت

کامل مایوسی اس لیے کامل تبدیلی کا عزم سے کامل مایوسی کا نتیجہ ہے اور اسی مایوسی سے کامل تبدیلی کا عزم پیدا ہوا ہے۔ ایک شخص جب گورنمنٹ سے نان کواپریشن کرتا ہے تو گویا اعلان کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہو چکا۔ وہ اس کی غیر منصف طاقت کے جواز سے منکر ہے اور اس لیے تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ پس جس چیز سے وہ اس درجہ مایوس ہو چکا کہ تبدیلی کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا۔ اس سے کیوں کر امید کر سکتا ہے کہ ایک منصف اور قابلِ بقا طاقت کی طرح اس کے ساتھ انصاف کرے گی؟

اس اصولی حقیقت سے اگر قطعِ نظر کر لیا جائے۔ جب بھی موجودہ حالت میں بریت کی امید رکھنا ایک بے سُود زحمت سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ گویا اپنی معلومات سے انکار ہوگا۔ گورنمنٹ کے سوا کوئی ذی حواس اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ بحالتِ موجودہ سرکاری عدالتوں سے انصاف کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے اشخاص سے مرکب ہیں جو انصاف کرنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسے نظام (سسٹم) پر مبنی ہیں جن میں رہ کر کوئی مجسٹریٹ ان ملزموں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ جن کے ساتھ خود گورنمنٹ انصاف

اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہِ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے! کاش! غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔

میں بیان کیوں دیتا ہوں؟

بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ بیان دوں لیکن ۶ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا تو میں نے دیکھا، کہ گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملے میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے حالاں کہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیئے۔

پہلے میرے خلاف دفعہ ۱۷-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کا دعویٰ کیا گیا تھا لیکن جب اس کا ویسا ثبوت بھی بہم نہ ہو سکا، جیسا آج کل اثباتِ جرم کے لیے کافی تصوّر کیا جاتا ہے، تو مجبوراً واپس لے لی گئی۔ اب ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مقصد برآری کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ جو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ وہ ان بہت سی باتوں سے خالی ہیں۔ جو میں اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور وہ شاید گورنمنٹ کے لیے زیادہ کارآمد ہوتیں۔ یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے

تھے۔ ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے، لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے۔ جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں۔

ایک عجیب مگر عظیم الشّان جگہ

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں۔ جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے۔ جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فدا کار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے، جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جُرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا۔ کیوں کہ میرے اعتقاد میں وہ ایک مقدس انسان تھے۔ جو نیکی اور محبّت کا آسمانی پیام لے کر آئے تھے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں تاہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے بُرے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اتنی بڑی ہستی کے لیے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں۔

حمد و شُکر

اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہُوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے، تو بے اختیار میری روح خدا کیلئے حمد و شکر میں ڈُوب جاتی ہے

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے۔ جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے۔ اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا۔ جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا۔ پس اگر گورنمنٹ مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس لیے سزا دلانا چاہتی ہے تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو۔

میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ فرشتہ کی طرح معصوم ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ پھر میں کیوں امید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی جو کر رہی ہے اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلے میں کیا ہے۔ پس یہ ایک ایسا قدرتی معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کے لیے شکوہ و شکایت کا کوئی موقعہ نہیں۔ دونوں کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیئے۔

کے دکھلا نہیں سکتی، اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دُوں میں جانتا ہوں کہ قانونِ عدالت کی رُو سے یہ میرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ میری جانب سے پراسیکیوشن کے لیے یہی بہت بڑی مدد ہے کہ میں نے ڈیفنس نہیں کیا۔ لیکن حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے۔ یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا۔ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کر سکا۔

اقرارِ جرم

ا۔ ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے۔ جیسا اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشوونما اور آزادی اور انصاف کی جدوجہد کو مبغوض رکھتا ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہے اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ازروئے انصاف کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ گویا تنازعِ للبقاء — STRUGGLE FOR EXISTANCE کی ایک جنگ ہوتی ہے جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے فریق کی طرح آخرالذکر بھی قابلِ ملامت نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہو۔ ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کر سکتے۔ یہ واقعہ ہے کہ نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابلِ ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش قابلِ ملامت نہیں ہے۔

کو کلکتہ نہ آتا - یا ۱۰ دسمبر سے پہلے باہر چلا جاتا - جس کی جلسۂ جمعیتہ العلمأ بدایون کی وجہ سے توقع تھی، تو گورنمنٹ بنگال مجھ سے تعرض نہ کرتی۔

۱۷ نومبر کے بعد دنیا کی تمام چیزوں میں سے جو چاہی جا سکتی ہے - وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ ۲۴ نومبر کو جب پرنس کلکتہ پہنچیں تو ہڑتال نہ ہو اور جو جبار نہ بے وقوفی ترمیم ضابطۂ فوجداری ۱۹۰۸ء کے نفاذ میں ہو گئی ہے وہ ایک دن کے لیے قبول کر لی جائے - وہ خیال کرتی تھی - کہ میری اور مسٹر سی - آر داس کی موجودگی اس میں حارج ہے، اس لیے کچھ عرصہ کے تذبذب اور غور و فکر کے بعد ہم دونوں گرفتار کر لیے گئے - گرفتاری بلا وارنٹ کے ہوئی تھی - لیکن جب دوسرے دن ضابطہ کی نمائش پوری کرنے کے لیے مجسٹریٹ جیل میں بھیجا گیا تو مسٹر داس کی طرح میری گرفتاری کے لیے بھی ۱۷-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کے ماتحت وارنٹ پیش کیا گیا۔

میں گزشتہ دو سال کے اندر بہت کم کلکتہ میں رہ سکا ہوں - میرا تمام وقت زیادہ تحریکِ خلافت کی مرکزی مشغولیت میں صرف ہوا - یا ملک کے پیہم دوروں میں - اکثر ایسا ہوا کہ مہینے کے بعد چند دنوں کے لیے کلکتہ آیا اور بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کر کے پھر چلا گیا - وسط نومبر سے بھی میں سفر میں تھا - ۱۶ ار کو کلکتہ سے روانہ ہوا تا کہ جمعیتہ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں شریک ہوں - وہاں مہاتما گاندھی کے تار سے بمبئی کی شورش کا حال معلوم ہوا اور میں بمبئی چلا گیا - جنوری تک میرا ارادہ واپسی کا نہ تھا - کیونکہ ۱۰ دسمبر کو جمعیتہ العلماء کا اسپیشل اجلاس بدایون میں تھا - اس میں شرکت ضروری تھی - اس کے علاوہ مجھے تمام وقت انگورہ

گورنمنٹ بنگال اور میری گرفتاری

۲۔ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا معاملہ جو کچھ تھا، گورنمنٹ آف انڈیا سے تھا وہ کسی خاص مُعیّن الزام کی بنا پر نہیں بلکہ موجودہ تحریک کی عام مشغولیت کی وجہ سے مجھے گرفتار کر سکتی تھی اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ گرفتاری کے لیے کوئی حیلہ پیدا کر لیتی، چنانچہ ملک میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا۔ کہ علی برادرز سے مجھے زیادہ مہلت دی گئی۔ مگر اب زیادہ عرصہ تک تغافل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ گورنمنٹ بنگال کے سامنے اس وقت میرا معاملہ نہ تھا۔ نہ وہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ اس دفعہ کے ثبوت میں جو تقریریں پیش کی گئی ہیں۔ وُہ نصف سال پہلے کلکتہ میں کی گئی ہیں اور گورنمنٹ نے مقدمہ کی اجازت ۲۲ دسمبر کو دی ہے۔ یعنی میری گرفتاری سے بارہ دن بعد۔ اگر فی الواقع ان تقریروں میں سڈلیشن تھا تو کیوں مجھے چھ ماہ تک گرفتار نہیں کیا گیا؟ اور اب گرفتار کیا بھی، تو گرفتاری کے بارہ دن بعد؟ ہر شخص ان دو واقعات سے صاف صاف سمجھ سکتا ہے کہ حقیقتِ حال کیا ہے؟ خصوصاً جب یہ تیسرا واقعہ بھی بڑھا دیا جائے۔ اُس میں جو دفعہ ظاہر کی گئی۔ وہ ۱۲۴۔ نہ تھی۔ ۱۷۔ ترمیم ضابطۂ فوجداری تھی۔ پچیس دن کے بعد مجھ سے کہا جاتا ہے کہ وہ واپس لے لی گئی ہے

گرفتاری کا اصلی باعث

حقیقت یہ ہے کہ میری گرفتاری میں اُس دفعہ کو دخل نہیں۔ یہ قطعی ہے کہ مجھے انہی حالات کے سلسلہ میں گرفتار کیا گیا جو، ار نومبر کے بعد رُونما ہوئے ہیں۔ اگر میں پہلی دسمبر

نے بلا امتیاز ہر شخص کو جو اس کے سامنے آگیا، گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ کوئی بات بھی جس سے ۲۴ کی ہڑتال کے رُکنے کا امکان ہو۔ پولیس اور پولیس سے بھی زیادہ "شریف قوم" سول گارڈ کے لیے ناجائز نہیں۔ سول گارڈ گویا قومی رضا کاروں کا جواب ہے۔ وہ بالکل نہتے ہونے پر بھی "جبر و تشدد" سے ہڑتال کرا دیتے تھے، یہ ریوالور سے مسلح ہونے پر بھی "امن و صلح" کے ذریعہ ہڑتال روک دیں گے۔

اس کے مقابلے میں لوگوں نے بھی برداشت اور استقامت، دونوں کا گویا آخری عہد لیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اپنی راہ سے ہٹیں گے، نہ تشدد کا مقابلہ کریں گے۔

ان حالات میں میرے لیے فرض کی راہ بالکل صاف اور یک سُو تھی۔ میں نے اپنے سامنے دو حقیقتیں بے نقاب دیکھیں۔ ایک یہ کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے۔ اس لیے فتح و شکست کا پہلا فیصلہ یہیں ہوگا۔ دوسری یہ کہ ہم کل تک پوری آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے تھے لیکن موجودہ حالت نے بتلا دیا کہ ہماری آزادی کی مبادیات تک محفوظ نہیں ہیں۔ آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ تحریر و اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر مل کی زبان میں انسانیت کے قتلِ عام سے کچھ ہی کم کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ پامالی بلا کسی جھجک کے علانیہ ہو رہی ہے۔ پس میں نے باہر کا تمام پروگرام منسوخ کر دیا اور فیصلہ کر لیا۔ کہ اس وقت تک کلکتہ ہی میں رہوں گا۔ جب تک دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ظہور میں نہ آجائے، یا گورنمنٹ اپنا کمیونک اور آرڈر واپس لے لے یا مجھے گرفتار کر لے۔

فنڈ کی فراہمی میں صرف کرنا تھا لیکن یکایک گورنمنٹ بنگال کے تازہ جبر و تشدد اور ۱۸ ر کے کمیونک کی اطلاع بمبئی میں ملی اور میرے لیے ناممکن ہو گیا کہ ایسی حالت میں کلکتہ سے باہر رہوں۔ میں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی، کہ مجھے تمام پروگرام ملتوی کر کے کلکتہ چلا جانا چاہیئے۔ زیادہ خیال ہمیں اس بات کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، گورنمنٹ کا جبر و تشدد لوگوں کو بے قابو کر دے اور کوئی بات صبر و ضبط کے خلاف کر بیٹھیں۔ علی الخصوص جب کہ "سول گارڈ" کے قیام کی خبریں بھی آ چکی تھیں اور اس بارے میں ہمیں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ نئی اسلحہ بندی کن شریفانہ اور پُرامن اغراض کے لیے وجود میں آئی ہے۔

میں پہلی دسمبر کو کلکتہ پہنچا۔ میں نے ظلم اور برداشت دونوں کے انتہائی مناظر اپنے سامنے پائے۔

میں نے دیکھا۔ کہ ۱۷ نومبر کی یادگار ہڑتال سے بے بس ہو کر گورنمنٹ اس آدمی کی طرح ہو گئی ہے جو جوش اور غصہ میں آپے سے باہر ہو جائے اور غیظ و غضب کی کوئی حرکت بھی اس سے بعید نہ ہو۔ ۱۹۰۸ء کے کریمنل لاء امنڈمنٹ ایکٹ کے ماتحت قومی رضا کاروں کی تمام جماعتیں "مجمع خلافِ قانون" ان لافل قرار دے دی گئی ہیں۔ پبلک اجتماعات یک قلم روک دیے ہیں۔ قانون صرف پولیس کی مرضی کا نام ہے۔ وہ "ان لافل جماعت" تفتیش اور شبہ میں جو چاہے کر سکتی ہے۔ حتی کہ راہ چلنتوں کی جان و آبرو بھی محفوظ نہیں۔ گورنمنٹ نے پہلے ۱۸ نومبر کے کمیونک میں صرف سابق و موجودہ رضا کار جماعتوں کا ذکر کیا تھا۔ لیکن ۲۴ کو دوسرا کمیونک جاری کر کے تمام آئندہ جماعتیں بھی خلاف قانونی قرار دے دیں اور پولیس

سکتا ہے کہ صرف برداشت اور قربانی کے ذریعہ خون ریز اسلحہ کا مقابلہ کیا جائے؟
البتہ میں نہیں جانتا، کہ ان دونوں فریقوں میں سے کس فریق کے اندر اس بڑے انسان
کی تعلیم تلاش کی جائے۔ جو برائی کے مقابلے میں صبر و عفو کی تعلیم لے کر آیا تھا؟ گورنمنٹ
میں یا ملک میں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ بیورو کریسی کے حکام اس کے نام سے ناواقف
نہ ہوں گے۔ اس کا نام "مسیح" تھا۔

گورنمنٹ کا فیصلہ اور شکست

۳۔ فلسفہ تاریخ ہمیں بتلاتا ہے کہ نادانی اور عاقبت نااندیشی ہمیشہ
زوال پذیر طاقتوں کی رفیق ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے خیال کیا کہ وہ جبر و تشدد سے
تحریک خلافت و سوراج کو پامال کر دے گی اور ۲۴ کی ہڑتال رک جائے گی اس
نے والنٹیر کور کو خلافِ قانون قرار دیا اور بلا امتیاز تمام کارکن گرفتار کر لیے گئے
وہ یہ بھی سمجھتی تھی، کہ والنٹیرز کی ممانعت اور کارکنوں کی گرفتاری کے بعد خلافت اور
کانگریس کا نظام معطل ہو جائے گا۔ اور اس طرح خود بخود ہڑتال رک جائے گی۔
لیکن بہت جلد گورنمنٹ کو معلوم ہو گیا۔ کہ جبر و تشدد جب قومی بیداری کے مقابلہ میں
نمایاں ہو تو وہ کوئی مہلک چیز نہیں ہوتی۔ نہ ہڑتال رک سکی، نہ خلافت اور کانگریس
کمیٹیاں معطل ہوئیں اور نہ والنٹیرز کا کام ایک دن کے لیے بھی بند ہوا۔ بلکہ ہماری
غیر موجودگی میں یہ ساری چیزیں زیادہ طاقت اور غیر مسخر ہو گئیں میں نے ۸ر دسمبر
کو جو پیغام ملک کے نام لکھا تھا، اس میں گورنمنٹ بنگال کے لیے بھی یہ پیغام تھا:۔
"میری اور مسٹر سی آر داس کی گرفتاری کے بعد کام زیادہ طاقت

گورنمنٹ نے ۱۰ ردسمبر کو مجھے گرفتار کر لیا۔ میں پورے اطمینان اور مسرت کے ساتھ جیل کی طرف روانہ ہوا۔ کیونکہ میں اپنے پیچھے ایک فتح مند میدان چھوڑ رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ کلکتہ اور بنگال نے میری توقعات پوری کر دیں۔ وہ پہلے جس قدر پیچھے تھا۔ اتنا ہی آج سب سے آگے ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کامیابی کے لیے گورنمنٹ کی امداد کا ہمیں پوری طرح اعتراف کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ۱۷ رنومبر کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتی۔ تو فی الواقع ہمارے لیے آئندہ کاموں کے انتخاب میں چند در چند مشکلات تھیں۔ ہم ۲۲ رکو بمبئی میں انہی مشکلات پر باہم غور و خوض کر رہے تھے۔

دو حقیقتیں

حقیقت یہ ہے کہ ان گزشتہ ایام نے بہ یک وقت دونوں حقیقتیں صفحاتِ تاریخ کے لیے مہیا کر دیں۔ اگر ایک طرف گورنمنٹ کے چہرے سے ادعاء و نمائش کے تمام نقاب دُور ہو گئے، تو دوسری طرف ملکی طاقت بھی ایک سخت آزمائش میں پڑکر پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ اگر گورنمنٹ ہر طرح کے جبر و تشدد میں بالکل بے حجاب اور بے لگام ہے۔ تو ملک میں بھی صبر برداشت کی طاقت روز افزوں نشو و نما پا رہی ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ انکار کیا گیا ہے۔ آج بھی اس کا موقعہ حاصل ہے کہ انکار کر دیا جائے۔ لیکن کل تاریخ کے لیے یہ ایک نہایت ہی عبرت انگیز داستان ہوگی۔ یہ مستقبل کی راہنمائی کرے گی۔ کہ کیوں کر اخلاقی مدافعت مادی طاقت کے جارحانہ گھمنڈ کو شکست دے سکتی ہے اور یہ کیسے ہو

ہے۔ ایک طرف تو وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر و تشدد کرے۔ دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائشی قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے۔ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ جمع نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی و درماندگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ جو لوگ اس کے خیال میں سب سے زیادہ مستحق تعزیر ہیں انہی کو سزا دلانا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ابھی چند ہی مہینے گزرے ہیں کہ ہم کراچی میں گورنمنٹ کی سراسیمگی و درماندگی کا تمسخر انگیز تماشا دیکھ رہے تھے جو سرکاری استغاثہ اس دعویٰ اور اہتمام کے ساتھ شروع کیا گیا۔ اس سے خود گورنمنٹ کی پسندیدہ اور انتخاب کردہ جیوری بھی اتفاق نہ کر سکی۔

لطف یہ ہے کہ یہ مشکلات گورنمنٹ کو ایسی حالت میں پیش آ رہی ہیں جب کہ وہ جانتی ہے کہ نان کو اپریٹرز کی جانب سے ڈیفنس نہیں کیا جائے گا اور سخت سے سخت غلط بیانی اور قانون شکنی کی حالت میں بھی پردہ دری اور شکست کا کوئی کھٹکا نہیں ہے۔

نئی قانونی تشریحات

گورنمنٹ نے اس اطمینان سے پوری طرح کام لینے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے۔ نان کو اپریٹرز کے مقدمات آج جس طرح چکائے جا رہے ہیں۔ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ "لا" اور "آرڈر" کے معنی بیوروکریٹک اصطلاح میں کیا ہیں؟ "لا" اور "آرڈر" کی طرح اب دعویٰ، ثبوت، شہادت، تشخیص، "آئی ڈینٹی فائی" وغیرہ تمام عدالتی مصطلحات کے معانی میں بھی انقلاب ہو گیا ہے۔ گویا نان کو اپریٹرز کو

اور مستعدی کے ساتھ جاری رہے گا۔ اور ۲۴ کو ہڑتال اس سے زیادہ مکمل ہوگی، جس قدر ہماری موجودگی میں ہو سکتی تھی۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گورنمنٹ خود اپنے پسند کیے ہوئے میدان میں ہار گئی۔ اب وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور جن لوگوں کو گرفتار کر چکی ہے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح سزا دلانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ بالکل بے سود ہے۔ طاقت ور آدمی کو شکست دینے کے بعد زیادہ غصہ آتا ہے لیکن کوئی شکست اس لیے فتح نہیں بن سکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجھلا سکتے ہیں۔

دفعہ ۱۲۴۔ الف

غرضیکہ میری گرفتاری صریح طور پر انہی واقعات کا نتیجہ ہے اور اسی لیے دو ہفتہ تک میرے خلاف دفعہ ۱۷۔ ترمیم ضابطہ فوجداری ہی کا دعویٰ قائم رہا۔ لیکن جب اس بارے میں کوئی سہارا نہ ملا۔ تو میرے پریس اور مکان کی تلاشی لی گئی تاکہ میری کوئی تحریر حاصل کر کے بنائے مقدمہ قرار دی جائے۔ جب وہاں سے بھی کوئی گوہر مراد ہاتھ نہ آیا۔ تو مجبوراً سی۔ آئی۔ ڈی کے محفوظ ذخیرہ کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ ذخیرہ ہمیشہ اس شریفانہ کام کے لیے مستعد رہتا ہے اور ضرورت مند کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ پس اس طرح بہ ہزار زحمت دفعہ ۱۲۴۔ الف کا دعویٰ تیار ہو گیا۔

اجتماعِ ضدّین

۴۔ یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آ رہی

قانون کا ڈرامہ

فی الحقیقت "لا" اور "آرڈر" کا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی ں کہہ سکتے ہیں۔

وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی۔ لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا سابق جسٹس ہے۔

۵۔ پراسیکیوشن کی جانب سے میری دو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جو میں نے پہلی اور پندرھویں جولائی کو مرزا پارک کے جلسہ میں کی تھیں۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ بنگال نے گرفتاریوں کی طرف پہلا قدم اُٹھایا تھا اور چار مبلغینِ خلافت پر مقدمہ چلا کر سزائیں دلائی تھیں۔ میں اس وقت سفر سے بیمار واپس آیا تھا میں نے دیکھا۔ کہ لوگوں میں بے حد جوش پھیلا ہُوا ہے اور ہر طرح کے مظاہرے کے لیے لوگ بے قرار ہیں۔ چونکہ میرے خیال میں گرفتاریوں پر مظاہرہ کرنا نان کوآپریشن کے اصول کے خلاف تھا۔ اس لیے میں نے ہڑتال اور جلوس یک قلم روک دیے۔ اس پر عوام کو شکایت ہوئی تو مَیں نے یہ جلسے منعقد کیے اور لوگوں کو صبر و تحمّل کی نصیحت کرتے ہوئے سمجھایا کہ نان وایلنس، نان کوآپریشن کے اصول میں یہ بات داخل ہے کہ گرفتاریوں پر صبر و سکون کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر فی الواقع اِن گرفتاریوں کا تمہارے دل میں درد ہے تو چاہیئے کہ اصلی کام کرو اور بیرونی کپڑا ترک کر کے دلیسی کھاڑھا بُوا پہن لو۔

کو جلد سزا دے دینے کے لیے ہر طرح کی بے قاعدگی اور قانون شکنی جائز ہے حتیٰ کہ اس بات کی بھی تحقیق ضروری نہیں کہ جس انسان کے ملزم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے کٹہرے کا ملزم وہی آدمی ہے بھی یا نہیں؟ ابھی اسی ہفتہ جوڑا بگان کی عدالت سے ایک شخص "عبدالرحمٰن ہاشم" کو اس پر دو رقانونی اور منطقی ثبوت پر چھ ماہ کی سزا دے دی گئی ہے کہ "اعظم ہاشم" نامی ایک خلافت والنٹیر دنیا میں وجود رکھتا ہے اور دونوں کے نام میں لفظ" ہاشم" مشترک ہے۔ خود میرے مقدمہ میں جو صریح بے ضابطگیاں کی گئی ہیں۔ ان کا ذکر لاحاصل سمجھ کر نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ وہی اس حقیقت کے لیے کافی تھیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ جو بے قاعدگی اور غلط بیانی دونوں کا مجموعہ ہے۔ مجھے دفعہ ۱۰۷ ترمیم ضابطہ فوجداری سے بری کر دیا گیا۔ اور ۱۲۴۔ الف کے ماتحت وارنٹ حاصل کیا گیا۔ قاعدہ کی رو سے رہائی اور ازسرِنو گرفتاری، دونوں باتیں آنی چاہیئیں تھیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۲۴۔ کا کوئی وارنٹ مجھ پر تعمیل نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ۶ جنوری تک مجھے اس کا علم بھی نہیں ہوا لیکن میرے سامنے مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر پولیس نے یہ حلفیہ شہادت دی ہے کہ اس نے پریذیڈنسی جیل میں مجھ پر وارنٹ سرو کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ نان کوآپریٹر کسی طرح کا ڈیفنس نہیں کرتے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے۔ اس لیے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کر لیں گے۔ شریف آدمیوں نے تو سچ مچ آنکھیں بند کر لی ہیں، لیکن دنیا کی بند نہیں ہیں۔

اگر تم ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے۔ کہ جن چالاک دشمنوں کے پاس خون ریزی کا بے شمار سامان موجود ہے انہیں رائی برابر بھی اس کے استعمال کا موقعہ نہ دو اور کامل امن و برداشت کے ساتھ کام کرو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تقریروں میں کوئی ایسی بات کہی جاتی ہے تو اس سے مقرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر لے، ورنہ اس کی دلی خواہش یہ نہیں ہوتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ آج تمہارے لیے یہ کام کر رہے ہیں، تم میں سے کوئی آدمی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ کہ وہ جیل جانے یا نظر بند ہونے سے ڈرتے ہیں (دلیپ)، اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ امن و نظم کے ساتھ کام کرنا چاہیئے، تو ان کا مطلب یہ نہیں (ہو سکتا) کہ اس ظالمانہ گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری کرنی چاہتے ہیں، جو گورنمنٹ اس کی طاقت اور اس کا تخت آج دنیا میں سب سے بڑا گنا جاتا ہے۔ یقیناً وہ اس گورنمنٹ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔"

وہ تو صرف اس لیے یہ کہتے ہیں کہ خود تمہاری کامیابی با امن رہنے پر موقوف ہے۔ تمہارے پاس وہ شیطانی ہتھیار نہیں ہیں، جن سے یہ گورنمنٹ مسلح ہے۔ تمہارے پاس صرف ایمان ہے، دل ہے، قربانی کی طاقت ہے۔ تم انہی طاقتوں سے (اصل میں "ہتھیاروں سے" ہوگا) کام لو۔ اگر تم چاہو کہ اسلحہ کے ذریعہ فتح کرو، تو تم نہیں کر سکتے۔ آج

استغاثہ نے جو نقل پیش کی ہے، وہ نہایت ناقص، غلط اور مسخ شدہ صورت ہے اور محض بے جوڑ اور بعض مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے، جیسا کہ اس کے پڑھنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ تاہم میں اس کے غلط اور بے ربط جملوں کو چھوڑ کر (کیونکہ اس کے اعتراف سے میرا ادبی ذوق اِبا کرتا ہے) باقی وہ تمام حصہ تسلیم کر لیتا ہوں جس میں گورنمنٹ کی نسبت خیالات کا اظہار ہے یا پبلک سے گورنمنٹ کے خلاف جد و جہد کی اپیل کی گئی ہے۔

استغاثہ کی جانب سے صرف تقریریں پیش کر دی گئی ہیں۔ یہ نہیں بتلایا ہے۔ کہ ان کے کن جملوں کو وہ ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہے؟ یا اس کے خیال میں مائی ڈیر برادران سے لے کر آخر تک سب ۱۲۴ الف ہے؟ میں نے بھی دریافت نہیں کیا۔ کیونکہ دونوں صورتیں میرے لیے یکساں ہیں۔ تاہم ان نقول کو دیکھتا ہوں تو استغاثہ کے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ قابلِ ذکر جملے حسبِ ذیل ہیں:۔

"ایسی گورنمنٹ ظالم ہے، جو گورنمنٹ ناانصافی کے ساتھ قائم ہو، ایسی گورنمنٹ کو یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیئے یا دنیا سے مٹا دینا چاہیئے۔"

"اگر فی الحقیقت تمہارے دلوں میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے، کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انہیں گرفتار کیا ہے وہ اس براعظم میں اسی طرح قائم رہے۔ جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت تھی؟"

اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا۔ کہ وہ ۱۲۴۔الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں۔ ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔

موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے

۷۔ یقیناً میں نے کہا ہے: "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے۔" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا۔ کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں۔ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔

میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں، یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو، میرے علم میں کوئی نہیں۔

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں، گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا۔ کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف

امن وسکون سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی چیز نہیں۔"

"اگر تم صرف چند گھڑیوں کے لیے گورنمنٹ کو حیران کرنا چاہتے ہو۔ تو اس کے لیے میرے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اگر خدانخواستہ میں اس گورنمنٹ کا استحکام چاہتا، تو وہ نسخے بتلا دیتا۔ (لیکن) میں تو ایسی جنگ چاہتا ہوں (جو ایک ہی دن میں ختم نہ ہو جائے بلکہ فیصلہ کے آخری دن تک جاری رہے) اور جب فیصلہ کی گھڑی آ جائے، تو پھر یا تو یہ گورنمنٹ باقی نہ رہے، یا تیس کروڑ (انسان) باقی نہ رہیں۔"

جو الفاظ بریکیٹ کے اندر ہیں۔ وہ تقریر کی پیش کردہ کاپی میں نہیں ہیں۔ لیکن عبارت کے بامعنی ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ میں نے اس لیے تصحیح کر دی کہ پراسیکیوشن کو استدلال میں مدد ملے اگر اس مقصد کے لیے پوری تقریر کی تصحیح و تکمیل ضروری ہو تو میں اسی طرح کر دینے کے لیے تیار ہوں۔

ان کے علاوہ دونوں تقریروں میں لوگوں کو نان کواپریشن کی دعوت دی ہے، مطالبات خلافت اور سوراج کو دہرایا ہے، پنجاب کے مظالم کو وحشیانہ کہا ہے، لوگوں کو بتلایا ہے کہ جو گورنمنٹ جلیانوالہ باغ امرت سر میں چند منٹوں کے اندر سینکڑوں انسانوں کو قتل کر ڈالے اور اس کو جائز فعل بتلائے، اس سے ناانصافی کی کوئی بات بھی بعید نہیں۔

اقرار

۶۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف انہی دو موقعوں پر بلکہ گزشتہ دو سال کے

تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

"اصلاحات اور بتدریج توسیعِ اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے۔ یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیئے۔ بعینہٖ ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائیداد اور قرض دار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہیئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکے تو قرضدار کو یہی کرنا پڑے گا۔ کہ قسط کی صورت میں وصول کرے لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہوگا۔ اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو سکتا۔

"ریفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان لیو ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) کے لفظوں میں کہوں گا: "اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے اپنا جیلر منتخب کر لینے کا اختیار مل جائے تو اس سے وہ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔"

میرے لیے اس کے اچھے برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے۔ میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز یقین کرتا ہوں۔

پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بُری ہے اسے یا تو درست ہو جانا چاہیئے یا مٹ جانا چاہیئے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں، تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا، کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

میرا یہ اعتقاد کیوں ہے؟

۸۔ میرا اور میرے کروڑوں ہم وطنوں کا ایسا اعتقاد کیوں ہے؟ اس کے وجوہ و دلائل اب اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ ملٹن کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے: "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس یہ محسوسات کے لیے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔

شخصی اقتدار بالذات ظُلم ہے

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت

اسلام اور بیوروکریسی

۹۔ میں مسلمان ہوں اور بہ حیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔

اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو۔ یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقت ور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیے اور دنیا کو بتلا دیا۔ کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیارِ فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہ ہے جس کے سب کام اچھے ہوں۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (سورۃ حجرات)

اگر وہ تمام نا انصافیاں ظہور میں نہ آتیں جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا۔ کیونکہ اس کی ہستی ہی سب سے بڑی نا انصافی ہے اور اس کی برائی کے لیے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اگر وہ اچھے کام کرے تو اس کی اچھائی تسلیم کر لی جائے گی لیکن اس کا وجود ناجائز اور نا انصافی ہی رہے گا۔ اگر ایک شخص ہماری جائیداد پر قابض ہو کر بہت اچھے اور نیک کام انجام دے تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو جا سکتا۔

برائی میں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے یا بری ہے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "زیادہ بری چوری" اور "کم بری چوری" لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے، کہ "اچھی چوری" اور "بری چوری"؟ پس میں بیوروکریسی کی اچھائی اور ناجائز ہونے کا کسی حال میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ فی نفسہٖ ایک ناجائز عمل ہے البتہ اس کی برائی کم اور زیادہ ہو سکتی ہے لیکن ہندوستان کی بیوروکریسی تو اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنی خلقی برائی ہی پر قانع رہتی۔ جب اس کی خلقی برائی پر اس کی بے شمار عملی برائیوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے تو پھر کیوں کر اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ظلم کا اعلان نہ کیا جائے؟

قومی اور مسلم بیوروکریسی ظلم ہے

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے اگر آج ہندوستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے. مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہو گا۔ کہ اس کو ظالم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔ اسلام کے علماءِ حق نے ہمیشہ جابر مسلمان بادشاہوں کے خلاف ایسا ہی اعلان و مطالبہ کیا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ نظام بعد کو قائم نہ رہ سکا مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شہنشاہی کے پُرشوکت افسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ جو لبسا اوقات پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح ملبوس ہوتا تھا، انہوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی تاہم تاریخ اسلام کا کوئی عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا جنہوں نے علانیہ حکامِ وقت کی استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو اور ان تمام تکلیفوں کو خوشی خوشی نہ جھیل لیا ہو جو اس راہ میں پیش آتی ہیں۔

اسلام ایک جمہوری نظام ہے

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مورخ گبن کے لفظوں میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا۔ پیغمبر اسلام اور اُن کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی اور صرف قوم کی رائے نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے "بادشاہ" کے اختیار اور شخصیت سے انکار کیا ہے۔ اور صرف ایک رئیس جمہوریت (پریذیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے لیکن اس کے لیے بھی "خلیفہ" کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنے نیابت کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا اسی طرح قرآن نے نظامِ حکومت کے لیے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ط چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن میں موجود ہے۔ "شوریٰ" کے معنی باہم مشورہ کے ہیں۔ یعنی جو کام کیا جائے۔ جماعت کے باہم رائے اور مشورہ سے کیا جائے شخصی رائے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیے کیا ہو سکتا ہے؟

خطرے میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی راہ باقی نہ رہے
حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدلا
جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے؟ وہ تو حقیقت ہے اور اس
وقت بھی حقیقت ہے۔ جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج
ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے، جب اس کے اظہار سے ہمارا
جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے، صرف اس لیے کہ
ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔

شہادت علی الناس

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں
کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں "شاہد" ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی
دینے والے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل
ڈیوٹی) ہے اور یہی ان کی قومی خصلت (نیشنل کیریکٹر) ہے جو ان کو
تمام پچھلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ
أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ اسی طرح پیغمبر اسلام
نے فرمایا: انتم شهداء الله فی الارض (بخاری) "تم خدا کی
زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو" پس ایک مسلمان جب
تک مسلمان ہے۔ اس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

مسلمانوں کا قومی وظیفہ

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اگر ہم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے۔ کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ اعلانِ حق کو روکا جائے۔ تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے، اور دو اور دو کو اس لیے چار نہ کہا جائے۔ کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو سچائی اور حقیقت ہمیشہ

اپنی ساری برائی کھو دیں۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ط

قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتاتا ہے "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ دنیا کی لالچ ان پر غالب آسکتی ہے نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی رکھتے تو صرف خدا سے اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے"

پیغمبر اسلامؐ کے بے شمار قولوں میں سے جو اس بارے میں ہیں ایک قول یہ ہے "نیکی کا اعلان کرو، برائی کو روکو، اگر نہ کروگے تو ایسا ہوگا کہ نہایت برے لوگ تم پر حاکم ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب تمہیں گھیر لے گا۔ تم دعائیں مانگو گے قبول نہ ہوں گی۔

(ترمذی و طبرانی عن حذیفہ و عمر)

لیکن یہ فرض کیونکر انجام دیا جائے تو اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین مختلف درجے بتلائے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے فرمایا:۔

"تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے تو چاہیئے۔ اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اعلان کرے اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے" (مسلم)

ہندوستان میں ہمیں یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے

کتمانِ شہادت

اگر وہ باز رہے تو یہ قرآن کی اصطلاح میں "کتمانِ شہادت" ہے یعنی گواہی کو چھپانا۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے اور بار بار کہا ہے کہ اسی کتمانِ شہادت کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں برباد و ہلاک ہوگئیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (بقرۃ) لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ

اَمر بالمعروف و نہی عنِ المنکر

اسی لیے اسلام کے واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدۂ توحید کے جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان میں سے ایک کام یہ ہے۔ قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اس لیے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو روکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ

کو شریک کرنا پس سچائی کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی ایک مسلمان کی زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھلاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کی سزاوار صرف خدا ہی کی عظمت و جبروت ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جس سے ڈرنا چاہیئے یا جس کے آگے جھکنا چاہیئے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا، خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا، اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حق دار ماننا ہے۔ یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

اسی لیے اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جا بجا کہتا ہے: "مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ہر حال میں سچی بات کہے۔" (وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہُ ط)۔ پیغمبر اسلام ؑ نے فرمایا: سب سے بہتر موت اس آدمی کی ہے۔ جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے۔" (ابو داؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد قرار لیتے تھے تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا: "میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا خواہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں" (بخاری و مسلم)

اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔ اسلام کے عالموں، پیشواؤں، بزرگوں مصنفوں کے تراجم (BAIOGRAHY) تمام تر اسی قربانی کی سرگزشت ہیں۔

گورنمنٹ کی برائیاں دُور کردیں۔ اس لیے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کرلیا۔

ارکانِ اربعہ

قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے۔ اور تبلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ ایمان۔ عمل صالح۔ توصیۂ حق۔ توصیۂ صبر۔

"توصیۂ حق" کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ "توصیۂ صبر" کے معنی یہ ہیں کہ ہر طرح کی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو جھیل لینے کی وصیت کرنا۔ چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں۔ اس لیے حق کے ساتھ صبر کی بھی وصیت ضروری تھی۔ تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے لیے تیار ہو جائے۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

اسلامی توحید اور امر بالمعروف

اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور توحید کا ضد شرک ہے، مقصود یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی

(ارسٹوکریٹ) کی بنیاد پڑی اور اسلام کے گلیم پوش خلیفہ کی جگہ شہنشاہیت کا تاج و تخت نمودار ہو گیا۔

تاہم مسلمانوں کی زبانیں جس طرح پہلے دَور کی آزادی میں بے رُک تھیں۔ اسی طرح دوسرے دور کے جبر و استبداد میں بھی بے خوف رہیں میں بتلانا چاہتا ہوں کہ تعزیراتِ ہند (پینل کوڈ) کی طرح اسلامی قانون میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔ الف نہیں۔

پہلے دَور کے مسلمانوں کی حق گوئی کا یہ حال تھا کہ دار الخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفۂ وقت سے برسرِ عام کہہ سکتی تھی: "اگر تم انصاف نہ کرو گے تو تکلے کی طرح تمہارے بل نکال دیں گے۔" لیکن وہ مقدمۂ بغاوت چلانے کی جگہ خدا کا شکر ادا کرتا کہ قوم میں ایسی راست باز زبانیں موجود ہیں۔ عین جمعہ کے مجمع میں جب خلیفہ منبر پر خطبہ کے لیے کھڑا ہوتا اور کہتا: "اَسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" سنو اور اطاعت کرو" تو ایک شخص کھڑا ہو جاتا اور کہتا: "نہ تو سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے۔" کیوں؟ اس لیے کہ تمہارے جسم پر جو چغہ ہے، وہ تمہارے حصہ کے کپڑے سے زیادہ کا بنا ہُوا ہے اور یہ خیانت ہے۔" اس پر خلیفہ اپنے لڑکے سے گواہی دلاتا وہ اعلان کرتا کہ میں نے اپنے حصہ کا کپڑا بھی اپنے باپ کو دے دیا تھا اس سے چغہ تیار ہُوا۔

قوم کا یہ طرزِ عمل اس خلیفہ کے ساتھ تھا جس کی صولت و

جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں۔ ان کے لیے دفعہ ۱۲۴۔الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہو سکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔

اِسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴ نہیں

تاریخ اسلام کے دو دور ہیں۔ پہلا دور پیغمبر اسلام اور ان کے چار جانشینوں کا ہے۔ یہ دور خالص اور کامل طور پر اسلامی نظام کا تھا۔ یعنی اسلامی جمہوریت (ری پبلک) اپنی اصلی صورت میں قائم تھی ایرانی شاہنشاہی اور رومی امارت (ARISTOCROCY) کا کوئی اثر ابھی اسلامی مساوات عامہ (DEMOCRAEY) پر نہیں پڑا تھا۔ اسلامی جمہوریہ کا خلیفہ خود بھی طبقہ عوام (ڈیموکریٹ) کا ایک فرد ہوتا تھا اور ایک عام فرد قوم کی طرح زندگی بسر کرتا تھا وہ دارالخلافت کے ایک خس پوش چھپر میں رہتا اور چار چار پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتا۔ اسلام کے دارالخلافت میں امریکن ری پبلک کا کوئی قصر سفید (وائٹ ہاؤس) نہ تھا۔

دوسرا دور شخصی حکمرانی اور شہنشاہی کا ہے جو خاندان بنو امیہ سے شروع ہوا اس دور میں اسلامی جمہوریت درہم برہم ہو گئی۔ قوم کے انتخاب کی جگہ طاقت اور تسلط کا دور شروع ہو گیا شاہی خاندان سے طبقہ امرا

ہشام بن عبدالملک نے طاؤس یمانی کو بلایا۔ وہ آئے مگر اس کا نام لے کر سلام کیا۔" امیرالمومنین" یعنی قوم کا سردار نہ کہا جو مسلمان خلفاء کا لقب تھا۔ ہشام نے سبب پوچھا۔ تو کہا قوم تیری حکومت سے راضی نہیں۔ اس لیے تجھے ان کا امیر کہنا جھوٹ ہے۔ ہشام نے کہا: "نصیحت کیجیئے" فرمایا: "خدا سے ڈر کیونکہ تیرے ظلم سے زمین بھر گئی"

مالک بن دینار بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کرتے تھے ان ظالم بادشاہوں کو خدا نے اپنے بندوں کا چرواہا بنایا تھا۔ تاکہ ان کی رکھوالی کریں۔ پر انہوں نے بکریوں کا گوشت کھا لیا بالوں کا کپڑا بن کر پہن لیا اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں"

سلیمان بن عبدالملک جیسے ہیبت ناک خلیفہ سے ابوحازم کہتے: " ان اباك قهروا الناس بالسيف و اخذ الملك عنوة من غير مشورة من المسلمين و لا رضا منهم" (تیرے باپ دادوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مقہور کیا۔ اور بلا قوم کی رائے اور انتخاب کے مالک بن بیٹھے۔ سلیمان نے کہا:" اب کیا کیا جائے؟" جواب دیا: "جن کا حق ہے انہیں لوٹا دے" کہا: "میرے لیے دعا کیجئے، خدایا! اگر سلیمان حق پر چلے تو اسے مہلت دے، لیکن اگر ظلم سے باز نہ آئے تو پھر تو ہے اور اس کی گردن"

سطوت نے مصراور ایران کا تخت الٹ دیا تھا۔ تاہم اسلامی حکومت میں کوئی دفعہ ۱۲۴-الف نہ تھی۔

دوسرا دور شخصی استبداد (Autocracy) کا تھا جس کی پہلی ضرب آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تقریر ہی پر پڑتی ہے لیکن اس دور میں بھی زبانوں کی بے باکی اور دلوں کی بے خوفی اسی طرح سرگرم رہی اور قید خانے کی تاریک کوٹھریاں، تازیانوں کی ضرب اور جلاد کی تیغ بھی انہیں روک نہ سکی۔ پیغمبر اسلام ؐ کے ساتھی (صحابۂ کرام رضؓ) جب تک زندہ رہے۔ وقت کے جابر بادشاہوں کے ظلم کا اعلان کرتے رہے اور برابر مطالبہ کرتے رہے کہ حکومت قوم کے مشورہ اور انتخاب سے ہونی چاہیئے۔ جو لوگ ان کے تربیت یافتہ تھے (تابعین) ان کا اعلان بھی بعینہٖ یہی رہا کہ درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ۔ امام محمد غزالیؒ نے جن کو یورپ کے مورخین فلسفہ بھی (Algazel) کے نام سے پہچانتے ہیں اور اب میڈیم کوریلی کے ناول (Ardath) کے دوسرے باب نے انگریزی علم و ادب کو بھی روشناس کر دیا ہے۔ صرف ان صحابہ اور تابعین کا ذکر کیا ہے۔ جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانے تک موجود تھے اور جنہوں نے حکمرانوں کے مظالم کا اعلان کر کے ہمیشہ منصفانہ اور نیابتی گورنمنٹ کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کی تعداد ۲۳- سے بھی زیادہ ہے۔

لکھوا دیا۔ "خدا کے مغرور بندے! ہارون کو جس کا ذوق ایمان غائب ہو چکا ہے، معلوم ہو! تو نے قوم کا مال بلا کسی حق کے اپنی تن آسانی میں لٹا دیا اور اس کا حال لکھ کر اپنے گناہ پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی گواہ ٹھہرایا۔ پس ہم سب کل کو اللہ کے آگے اس کی گواہی دیں گے۔ اے ہارون! تو نے انصاف و حق سے کنارہ کیا۔ تو نے پسند کیا کہ ظالم بنے اور ظالموں کی سرداری پائے۔ تیرے حاکم بندگان خدا کو ظلم و جور سے پامال کر رہے ہیں اور تو تخت شاہی پر عیش و عشرت کر رہا ہے۔" ہارون نے جب یہ خط پڑھا تو بے اختیار رونے لگا اور کہا یہ خط ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔

مسلمان عالموں اور اماموں پر موقوف نہیں، اس عہد کا ہر عام فرد بھی اس اعلان میں بے خوف تھا۔ منصور عباسی ایک دن کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ آواز آئی، کہ کوئی شخص دعا مانگ رہا ہے۔ "خدایا میں تیرے آگے فریاد کرتا ہوں، ظلم غالب آ گیا ہے اور حق اور حقداروں کے درمیان روک بن گیا ہے۔ منصور نے اس شخص کو بلا کر پوچھا وہ کون ہے جس کا ظلم روک بن گیا ہے؟ کہا "تیرا وجود اور تیری حکومت"۔

حجاج بن یوسف کا ظلم و ستم تاریخ اسلام کا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ لیکن اس کی بے پناہ تلوار بھی مسلمانوں کی حق گوئی پر غالب نہ آ سکی۔ حطیط جب گرفتار ہو کر آیا۔ پوچھا۔ اب میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: "تو خدا کی زمین پر اس کا سب سے بڑا دشمن ہے"۔

سعید بن مسیبؒ بہت بڑے تابعی تھے۔ وہ علانیہ برسرِ بازار حکام کے ظلم و جور کا اعلان کرتے اور کہتے: "کتوں کا پیٹ بھرتے ہو مگر انسانوں کو تم سے امان نہیں۔"

اس عہد کے بعد بھی مسلمان عالموں اور پیشواؤں کی حق گوئی کا یہی عالم رہا۔ منصور عباسی کے خوف و ہیبت سے گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ کانپا کرتے تھے۔ سفیان ثوریؒ سے ایک بار اس نے کہا: "مجھ سے اپنی کوئی حاجت بیان کیجئے۔" انہوں نے جواب دیا "اتق اللہ فقد ملأت الارض ظلما و جورا"۔ (خدا سے ڈر۔ زمین ظلم و جور سے بھر گئی ہے۔)

جب مشہور عباسی خلیفہ، ہارون الرشید تخت نشین ہوا، جس نے فرانس کے شارلیمین کو ایک عجیب گھڑی بطور تحفہ کے بھیجی تھی اور قیصر روم کو بقول گبن "اے کتے کے بچے" کے لقب سے خط لکھا تھا، تو اس نے انہی سفیان ثوریؒ کو اپنے ہاتھ سے اشتیاق ملاقات کا خط لکھ کر بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں نے تخت نشینی کی خوشی میں بے شمار مال و دولت لوگوں میں تقسیم کی ہے۔ تم بھی مجھ سے آکر ملو۔ سفیان کوفہ کی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے اندر بیٹھے تھے کہ یہ خط پہنچا۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "جس چیز کو ایک ظالم کے ہاتھ نے چھوا ہے میں اسے چھونا نہیں چاہتا۔" جب پڑھ کر سنایا گیا۔ تو اسی کی پشت پر جواب

سعدی شیرازیؒ نے (جن کی "گلستان" کا نام اس کورٹ نے بھی سنا ہوگا)، ہلاکو خاں کے منہ پر اسے ظالم کہا۔ شمس الدین نیازی نے منکو خاں کے دربار میں اس کی ہلاکت کی دعا مانگی۔ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ نے اباقا آن پر برسرِ دربار لعنت بھیجی۔ تاتاریوں کے پاس بے دریغ قتل کر دینے کا قانون تھا۔ تاہم "تورۂ چنگیز خانی" (قوانین چنگیز خاں) میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔ الف نہ تھی۔

"حجاج" اور "ریڈنگ"

"ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ (جن کی اطاعت از روئے شرع ہم پر واجب ہے) ایسا سلوک رہا ہے تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی "از روئے قانون قائم شدہ" گورنمنٹ ہمارے لیے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے جو "از روئے اسلام" واجب اطاعت ہے؟ کیا انگلستان کی پادشاہت اور لارڈ ریڈنگ کی نیابت، عبدالملک کی خلافت اور حجاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لیے زیادہ مقتدر ہو سکتی ہے؟ اگر ہم "اجنبی و غیر مسلم" اور "قومی و مسلم" کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظر انداز کر دیں۔ جب بھی ہم سے یہی امید کی جا سکتی ہے؟ کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لیے کہہ چکے ہیں، وہی "چمسفورڈ اور

پُوچھا۔ خلیفہ کے لیے کیا کہتے ہو؟ کہا اس کا جرم تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ تیرا ظلم تو اس کے بے شمار ظلموں میں سے ایک ظلم ہے؛
مامون الرشید کے عہد میں ایسے مسلمان موجود تھے جو پکار پکار کر بر سرِ دربار کہتے: یا ظالم! انا ظالم ان لم اقل لك یا ظالم! "اے ظالم! میں ظالم ہوں اگر تجھے ظالم کہہ کر نہ پکاروں۔"

فتنۂ تاتار اور فتنۂ یورپ

یہ تو تاریخ اسلام کے ابتدائی اوراق ہیں لیکن اس عہد کے بعد بھی ہر دور کا یہی حال رہا۔ مسلمانوں کے لیے موجودہ عہد کا عالمگیر فتنہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے سیلاب میں ڈوب کر اچھل چکے ہیں۔ جس طرح آج یورپ اور علی الخصوص انگلستان کے ظہور و تسلط سے تمام ایشیا اور اسلامی ممالک کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پندرھویں صدی مسیحی میں بھی تاتاریوں کے وحشیانہ تسلط سے ظہور میں آیا تھا۔ یورپ کے فتنہ کا آخری نتیجہ عثمانی خلافت کی پامالی اور ایشیائے کوچک کا قتلِ عام ہے۔ تاتاری فتنہ کی آخری وحشت ناکی عباسی خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتلِ عام تھا۔ تاتاری انسان نہیں تھے، درندے تھے۔ تاہم ہلاکو خاں، منکو خاں اباقا آن خاں جیسے سفاکوں کے زمانے میں بھی وہ مسلمان موجود رہے جن کی زبانیں اعلان میں ان کی تلواروں سے بھی زیادہ تیز تھیں۔ شیخ

طرح کی قربانیاں کیں۔ اجنبیوں کے مقابلے میں سرفروشی بھی کی اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھائی۔ پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی جنگی جدوجہد کوئی مثال نہیں رکھتی۔ اسی طرح دوسری صورت میں ان کی شہری جدوجہد بھی عدیم النظیر رہی ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے حالاں کہ مقابلہ ان کا پہلی حالت سے ہے۔ ان کے لیے جنگی جدوجہد کا وقت آگیا تھا۔ لیکن انہوں نے "شہری جدوجہد" کو اختیار کیا انہوں نے "نان وائلینس" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کریں گے۔ یعنی صرف وہی کریں گے جو انہیں مسلمان حکومتوں کے مقابلے میں کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ اس طرز عمل میں ہندوستان میں ایک خاص طرح کی حالت کو بھی دخل ہے لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیئے۔ کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہو گئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں جو انہیں اپنوں کے مقابلے میں کرنی تھی۔

انقلاب حال

میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں، کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی درد انگیز ہے کہ

ریڈنگ" کی گورنمنٹوں کے لیے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا۔ "اِتَّقُوا اللّٰہَ فَقَدْ مَلَأْتِ الْاَرْضَ ظُلْمًا وَّجَوْرًا" خدا سے ڈرو کیونکہ تمہارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے یہی ہم آج بھی کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لیے ہمیں بتلایا گیا تھا۔ نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرّف کے مقابلہ میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے، تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا۔ کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگزر کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کو برطانیہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔

اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلے میں دو طرح کے طرزِ عمل کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں۔ ایک ظلم اجنبی قبضہ و تسلط ہے ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے۔ پہلے کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لیے حکم ہے کہ مقابلہ نہ کیا جائے لیکن امر بالمعروف اور اعلانِ حق جس قدر بھی امکان میں ہو ہر مسلمان کرتا رہے پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہونا پڑے گا۔ دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑیں گی مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنی چاہئیں اور دونوں کا نتیجہ کامرانی و فتح مندی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں

آزادی یا موت

لیکن انسانوں کی بدعملی سے تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جاسکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہیئے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

اسی لیے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جان فروشی ان کا قدیم ورثہ ہے۔ ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بے کار نہ گئیں مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔

مسئلہ خلافت و پنجاب

۱۰۔ میں یہاں گورنمنٹ کی ان ناانصافیوں کا افسانہ نہیں چھیڑونگا جو "مسئلہ خلافت" اور "مظالم پنجاب" کا عالمگیر افسانہ ہیں لیکن میں اقرار کروں گا کہ گزشتہ دو سال کے اندر کوئی صبح و شام مجھ پر ایسی نہیں گزری ہے۔ جس میں میں نے "خلافت" اور "پنجاب" کے لیے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے

ایک مسلمان سے کتمانِ شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴-الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمران ظالم ہے یہ واقعہ خلیفہ عبد الملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴-الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو۔

میں اس درد انگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلابِ حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انہوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں۔

وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی، وہ اپنے تمام وعدوں کے توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی، وہ سمرنا اور تھریس کو صریح نامنصفانہ طور پر یونانیوں کے حوالہ کر دیتی ہے اور پھر میں نے ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو (جب میں رانچی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے نظر بند تھا) لارڈ چیمسفورڈ کو ایک مفصل چٹھی لکھی تھی اس میں واضح کر دیا تھا کہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں؟ میں نے لکھا تھا۔ کہ اگر برٹش گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ممالک پر خلافِ وعدہ متصرف ہو گئی۔ تو اسلامی قانون کی رُو سے ہندوستانی مسلمان ایک انتہائی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان کے لیے صرف دو ہی راہیں رہ جائیں گی۔ یا اسلام کا ساتھ دیں یا برٹش گورنمنٹ کا۔ وہ مجبور ہوں گے کہ اسلام کا ساتھ دیں۔

بالآخر وہی ہُوا۔ گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز نہ رہی۔ اس وعدہ کا بھی ایفاء ضروری نہ سمجھا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲ر نومبر ۱۹۱۴ء کے اعلان میں کیا تھا اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہُوا۔ جو مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا۔ شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے۔ لیکن طاقت ور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں ہے۔

جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کر رہی ہو اور مظالم پنجاب کے لیے
کوئی تلافی اور شرمندگی نہ رکھتی ہو۔ ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی
کے دل میں وفاداری نہیں ہو سکتی۔ گورنمنٹ کی جگہ وہ ایک فریق محارب
کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر قائم رہیں گے۔ جب تک انہیں اپنا
مذہب اور مذہب کے اٹل احکام عزیز ہیں۔
مسلمانوں کو یقین ہو گیا ہے کہ وہ حق و انصاف چاہتے ہیں۔ تو
اس کی راہ صرف ایک ہی ہے۔ سوراج کا حصول یعنی ایسی قومی گورنمنٹ
کا حصول جو ہندوستانیوں کی ہو، ہندوستان میں ہو اور ہندوستان کے
لیے ہو۔

اگر ظلم نہیں تو کیا عدل ہے؟

۱۱۔ غرضکہ اس بارے میں میرا اقرار بالکل صاف اور واضح ہے
موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے وہ کروڑوں انسانوں
کی مرضی اور خواہش کے لیے محض نفی ہے۔ وہ ہمیشہ انصاف و سچائی
پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام
جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لیے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں
مانتی۔ کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں، وہ بے گناہ
لڑکوں کو صرف اس لیے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہو جانے
دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی طرح "یونین جیک" کو سلام نہیں کرتے؟

کیا "عادل" اور "نہ درست ہو، نہ مٹو" کہوں؟

کیا صرف اس لیے کہ ظالم طاقت ور ہے اور اس کے پاس جیل ہے اس کا حق دار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے؟ میں اٹلی کے نیک اور حریت پرست جوزف میزینی Mazzini کی زبان میں کہوں گا: "ہم صرف اس لیے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہے، تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کر سکتے"۔

"جرم" کا قدیم اور ناقابلِ شمار ارتکاب

۱۲۔ میں نہایت متعجب ہوں کہ میرے خلاف صرف یہی دو ناتمام و ناکافی تقریریں کیوں پیش کی گئی ہیں؟ کیا ان ہزاروں صفحات سے جو میرے قلم سے نکل چکے ہیں اور ان بے شمار تقریروں سے جن کی صدائیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں گونج چکی ہیں۔ صرف یہی سرمایہ گورنمنٹ پہنچا سکی؟ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری کوئی تقریر دو سال کے اندر ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں یہ تمام باتیں میں نے بیان نہ کی ہوں۔

میں متصل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری ۱۸۔ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہدِ شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا۔ میں اسی

اس حالت نے مسلمانوں کے لیے آخری درجہ کی کش مکش پیدا کردی۔ اسلامی قانون کی رو سے کم از کم بات جو ان کے فرائض میں داخل تھی، یہ تھی کہ ایسی گورنمنٹ کی اعانت اور کوآپریشن سے ہاتھ کھینچ لیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ اس وقت تک تمام اسلامی آبادی کے قتل و غارت کا تماشا دیکھتی ہے۔

انصاف کی پامالی میں اس کی جرأت ان تھک اور دلیری بالکل بے باک ہے اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اس کے منہ میں کوئی لگام نہیں۔ سمرنا میں ۸۰ فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے، مگر وزیر اعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی کثرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو خون اور آگ کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے لیکن وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی داستانیں بیان کرتا رہتا ہے اور خود انگلستان کے بھیجے ہوئے امریکن کمیشن کی رپورٹ پوشیدہ کر دی جاتی ہے۔

پھر نہ تو ان تمام مظالم و جرائم کے لیے اس کے پاس اعتراف ہے، نہ تلافی۔ بلکہ ملک کی جائز اور با امن جدوجہد کو پامال کرنے کے لیے ہر طرح کا جبر و تشدد شروع کر دیا جاتا ہے اور سب کچھ کیا جاتا ہے جو گزشتہ ایک سال کے اندر ہو چکا ہے اور ۱۸ نومبر سے اس وقت تک ملک کے ہر حصہ میں ہو رہا ہے میں اگر ایسی گورنمنٹ کو "ظالم اور تیا درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ" نہ کہوں تو

تعداد بہت زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر "الہلال" نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اسی سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت دسوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے پہلے "الہلال" کی ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا۔ تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کر دیا۔

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" تمام تر "آزادی یا موت" کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک پہ بحث و نظر کی بنیاد ڈالی۔ اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارہ کردوں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے ہیں۔ "الہلال" اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی نئی اور طاقتور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی۔ جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے فروغ پا لیا۔

خلافت کانفرنس کلکتہ

۱۴۔ چار سال کے بعد پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو میں رہا کیا گیا۔ اس وقت

کی خاطر چار سال تک نظر بند رہا۔ مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح و شام اسی کی تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوئی۔ رانچی کے در و دیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ جہاں میں نے نظر بندی کا زمانہ بسر کیا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے میں صرف اسی ایک کام کے لیے جی سکتا ہوں۔ اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط

آخری اسلامی تحریک

۱۳۔ میں اس "جرم" سے کیوں کر انکار کر سکتا ہوں جب کہ میں ہندوستان کی اس "آخری اسلامی تحریک" کا داعی ہوں جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹیکل مسلک میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا۔ جہاں آج نظر آ رہے ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر فرد میرے اس جرم میں شریک ہو گیا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں اردو جرنل "الہلال" جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امرِ واقع ہے کہ "الہلال" نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں بالکل ایک نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انہیں اس فریب میں مبتلا رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی

اسی کانفرنس میں فوج کے متعلق وہ ریزولیوشن منظور ہوا تھا جس میں اسلامی قانون کے بموجب مسلمانوں کے لیے فوجی نوکری ناجائز بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ملکوں کے خلاف برسر پیکار ہے۔ کراچی کا مقدمہ اسی ریزولیوشن کی بنا پر چلایا گیا۔ میں بار بار اخبارات اور تقریروں میں اعلان کر چکا ہوں۔ کہ یہ رزولیوشن سب سے پہلے میں نے ہی تیار کیا تھا اور میری ہی صدارت میں تین دفعہ منظور ہوا۔ سب سے پہلے کلکتہ میں، پھر بریلی اور لاہور میں۔ پس اس "جرم" کی تعزیر کا بھی پہلا حق دار میں ہی ہوں۔

میں نے اس ایڈریس کو مزید اضافہ کے بعد کتاب کی شکل میں بھی مرتب کیا۔ جو انگریزی ترجمہ کے ساتھ بار بار شائع ہو چکا ہے اور گویا میرے "جرائم" کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔

میری زندگی سرتاسر ۱۲۴ الف

۱۵۔ میں نے گزشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مسٹر گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا۔ کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں میں نے خلافت، پنجاب سوراج اور نان کوآپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔

سے گرفتاری کے لمحہ تک میرا تمام وقت انہی مقاصد کی اشاعت اور تبلیغ میں صرف ہُوا ہے۔ ۲۸ اور ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہُوا تھا اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر اپنا آخری اعلان کر دیا تھا۔

"اگر برٹش گورنمنٹ نے مطالباتِ خلافت کی اب بھی سماعت نہ کی تو مسلمان اپنے شرعی احکام سے مجبور ہو جائیں گے۔ کہ تمام وفادارانہ تعلقات منقطع کر لیں"

میں اس کانفرنس کا پریذیڈنٹ تھا۔

میں نے اس کے طولانی پریذیڈنشل ایڈریس میں وہ تمام امور بہ تفصیل بیان کر دیے تھے جو اس قدر ناقص شکل میں ان دو تقریروں کے اندر دکھلائے گئے ہیں۔

موالات اور فوجی ملازمت

میں نے اسی ایڈریس میں اس اسلامی حکم کی بھی تشریح کر دی تھی، جس کی بنا پر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ سے "ترکِ موالات" کریں۔ یعنی کواپریشن اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ یہی "ترکِ موالات" ہے۔ جو آگے چل کر "نان کواپریشن" کی شکل میں نمودار ہُوا اور مہاتما گاندھی جی نے اس کی سربراہی کی۔

اپنے تمام جبر و تشدد اور خون ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے لیکن ہمارا اعتقاد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے میں اسے فطرت الٰہی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے متفق ہوں اور ان دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلنس جدوجہد کے ذریعہ فتح مند ہوگا اور اس کی فتح مندی اخلاقی و ایمانی فتحمندی کی یادگار مثال ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو باامن جدوجہد کی تلقین کی اور اسی کو کامیابی کی سب سے پہلی شرط قرار دیا۔ خود یہ تقریریں بھی اسی موضوع پر تھیں جیسا کہ پیش کردہ نقول سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ میں ان چند مسلمانوں میں سے ہوں جو بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر انھوں نے نہایت مضبوطی کے ساتھ مسلمانوں کو باامن جدوجہد پر قائم نہ رکھا ہوتا تو نہیں معلوم مسئلۂ خلافت کی وجہ سے ان کا صبر آزما اضطراب کیسی خوفناک شکل اختیار کرلیتا؟ کم از کم ہندوستان کے ہر حصہ میں " مالی بار" کا منظر تو ضرور نظر آجاتا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس ہُوا۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء کا بریلی میں جلسہ ہُوا۔ گزشتہ اکتوبر میں یو۔پی پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ میں منعقد ہوئی۔ نومبر میں آل انڈیا علماء کانفرنس کا لاہور میں اجلاس ہُوا۔ ان تمام کانفرنسوں کا بھی میں ہی صدر تھا۔ لیکن ان میں بھی تمام مقررین نے جو کچھ کہا اور صدارتی تقریروں میں میں نے جو خیالات ظاہر کیے ان سب میں وہ تمام باتیں موجود تھیں، جو ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔ بلکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ان سے بہت زیادہ قطعی و واضح خیالات ظاہر کیے گئے تھے۔

اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴-الف کا جرم ہیں تو میں نہیں سمجھتا۔ کہ پہلی اور پندرھویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقع اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴-الف کے اور کوئی کام نہیں کیا۔

نان وائلنس، نان کوآپریشن

۱۶- ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وائلنس نان کوآپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت

مثلاً میں نے یکم جولائی کی تقریر میں مشہور فرنچ شاعر اور ادیب وکیٹر ہیوگو کا قول نقل کیا تھا:۔

"وہ آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو"

مختصر نویس نے "ظلم" کی جگہ "دھرم" لکھ دیا ہے جو صریح غلط اور بے موقع ہے البتہ اس کی آواز "ظلم" سے مشابہ ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر ہے:۔

"انہوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برباد کیا ہے"

حالانکہ مصیبت کو برباد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ غالباً میں نے "برداشت کیا ہے" کہا ہوگا یعنی انہوں نے جیل کی مصیبت جھیل لی ہے۔ چونکہ دونوں لفظوں کی آواز ملتی جلتی ہے اور مختصر نویس خود فہم و امتیاز سے محروم ہے، اس لیے "برداشت" کی جگہ "برباد" لکھ گیا۔

اُردو مُختصر نویسی

اصل یہ ہے کہ اردو مختصر نویسی کا قاعدہ اور مختصر نویس کی ناقابلیت دونوں ان نقائص کے لیے ذمہ دار ہیں۔

اردو مختصر نویسی کا قاعدہ ۱۹۰۵ء میں کرسچین کالج لکھنؤ کے دو پروفیسروں نے ایجاد کیا۔ جن میں سے ایک کا نام مرزا محمد ہادی بی اے ہے۔ میں اس وقت لکھنؤ ہی میں تھا، اس لیے مجھے ذاتی طور پر اس کے

سی آئی ڈی کے رپورٹر

۱۷۔ اب جب کہ میں ان دو تقریروں کے تمام ان حصوں کا اقرار کر چکا ہوں جن سے پراسیکیوشن استدلال کر سکتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں اگر چند الفاظ ان کی پیش کردہ صورت کی نسبت بھی کہہ دوں۔
سی آئی ڈی کے گواہوں نے بیان کیا ہے کہ میری تقریروں کے نوٹس بھی لیے گئے اور مختصر نویسی کے ذریعہ بھی قلم بند کی گئیں۔ جو کاپی داخل کی گئی ہے (اگزویٹ اے اور سی) وہ مختصر نویس کی مرتب کی ہوئی ہے لیکن یہ میری تقریروں کی ایسی مسخ شدہ صورت ہے کہ اگر چند ناموں اور واقعات کی طرف اشارہ نہ ہوتا تو میرے لیے شناخت کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ بلاشبہ ایک چیز ہے جو دور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی ہے لیکن میں نہیں جانتا، کہ کیا چیز ہے؟ محض بے جوڑ، بے تعلق اور اکثر مقامات پر بے معنی جملے ہیں۔ جو بغیر کسی ربط اور سلسلہ کے صفحوں پر بکھیر دیے گئے ہیں۔ گرامر اور محاورہ دونوں سے انہیں یک قلم انکار ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹر تقریر سمجھنے اور قلم بند کرنے سے عاجز تھا۔ اس لیے درمیان سے جملوں کے جملے چھوڑتا جاتا ہے اور تمام حروف ربط و تعلیل تو بالکل ہی حذف کر دیے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمام وہ الفاظ جن کی آواز یا اسپیلنگ (املا) میں ذرا سا بھی بہ تشابہ ہے، بالکل ہی بدل گئے ہیں اور عبارت یا تو بے معنی ہو گئی ہے یا محرف

نے قلم بند کیا جو عرصہ تک یو پی کے محکمہ سی آئی ڈی میں کام کرنے کے بعد مستعفی ہُوا ہے لیکن جب لانگ ہینڈ میں مرتب کر کے مجھے دکھلایا گیا تو اس کا کوئی حصہ صحیح اور مکمل نہ تھا۔

یہ تو اصل قاعدہ کا نقص ہے۔ لیکن جب اس پر مختصر نویس کی نااہلیت کا بھی اضافہ ہو جائے تو پھر کوئی خرابی ایسی نہیں ہے جس سے انسانی تقریر مسخ نہ کی جا سکے۔ کلکتہ اور بنگال کی مخصوص حالت نے اس نقص کو اور زیادہ پُر مصیبت بنا دیا ہے۔ یہاں کے دیسی اور یورپین افسر خود اردو زبان سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ معمولی طور پر بول بھی نہیں سکتے۔ ان کے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی زبان سے کسی مختلف لہجہ میں آواز نکالے اردو اسکالر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پولیس اور عدالت ان رپورٹروں اور مختصر نویسوں کو بطور سند کے استعمال کر رہی ہے جن بیچاروں کی استعداد پر ہمیشہ ہم لوگ تمسخر کیا کرتے ہیں۔

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلکتہ کی پولیس اور عدالتوں میں ایک شخص بھی اردو زبان کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے اگر یہاں اس حقیقت کا کچھ بھی احساس ہوتا تو صرف یہی بات بطور ایک عجیب واقعہ کے خیال کی جاتی۔ کہ میری تقریروں کے لیے پولیس اور سی۔ آئی ڈی کے غریب رپورٹروں کی شہادت لی جا رہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کم از کم یہ منظر ضرور میرے لیے تکلیف دہ ہے۔

دیکھنے اور موجدوں سے گفت گو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے موجدوں نے انگریزی علامات کو بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا ہے لیکن وہ اردو حروف و املاء کو پوری طرح محفوظ کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خود انہیں بھی اس نقص کا ایک حد تک اعتراف تھا۔ لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ مختصر نویس کی ذاتی قابلیت اور حافظہ و مناسبت سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ میں اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تجربے سے ان کا خیال درست نہ نکلا صوبجاتِ متحدہ کی گورنمنٹ نے ابتدائی تجربے کے لیے دو پولیس انسپکٹروں کو تعلیم دلائی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے آزمائشی طور پر جن پبلک تقریروں کو قلم بند کیا۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ میری اور شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی مرحوم کی تقریریں تھیں۔ ہم دونوں نے انجمن اسلامیہ ہردوئی کے سالانہ جلسے میں لیکچر دیے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے فی منٹ ساٹھ لفظوں کی رفتار سے تقریر کی تھی اور میری تقریر فی منٹ ۸۰ سے ۹۰ تک تھی۔ جیسا کہ خود مختصر نویسوں نے ظاہر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی تیز رفتار نہ تھی۔ تاہم جب انہوں نے اپنا کام مرتب کر کے دکھلایا تو بالکل ناقص اور غلط تھا۔ اس کے بعد بھی مجھے بارہا اپنی تقریروں کے قلم بند کرانے کا اتفاق ہوا لیکن ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ نکلا۔ ابھی حال کی بات ہے کہ خلافت کانفرنس آگرہ میں میرا زبانی پریذیڈنشل ایڈریس ایک مشّاق مختصر نویس سید غلام حسین

کر کتابوں کے ٹائیٹل پیج کو صحت کے ساتھ پڑھ لیتا۔

میں نے نظربندی کے زمانے میں چار سال تک اپنی ڈاک کے لیے خود ہی سنسرشپ کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ کیونکہ جو سرکاری افسر اس غرض سے مقرر کیا گیا تھا وہ اس قدر قابل آدمی تھا کہ اردو کے معمولی لکھے ہوئے خطوط بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ اکثر میری ڈاک صرف دستخط کر کے بھیج دیتا اور شب کو آکر مجھ سے اس کا ترجمہ لکھوا لیتا۔

جب کہ نظربندی میں میں اپنی ڈاک کی خود ہی نگرانی کر رہا تھا تو شملہ اور دہلی کے حکام اپنی کارفرمائی پر نہایت نازاں تھے اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنے ایک خطرناک دشمن کو بالکل مجبور اور معطل کر دیا ہے۔

اس وقت بھی میرے قلمی مسودات کلکتہ پولیس کے قبضہ میں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک جرم تاریخ، تفسیر قرآن اور لٹریچر ہے۔

میں یہاں عربی دان اشخاص کی دلچسپی کے لیے ان کتابوں کے چند نام درج کر دیتا ہوں جنھیں نہایت خوفناک سمجھ کر پولیس نے شملہ بھیجا تھا اور عرصہ تک سر چارلس کلیولینڈ کے حکم سے میری نظربندی کے دیگر معاملات کی طرح ان کی بھی تحقیقات ہوتی رہی۔

فتح القدیر، شرح ہدایہ، طبقات الشافعیہ سبکی، ازالۃ الخفاء، کتاب الام، مدونہ امام مالک، مطالب عالیہ امام رازی، شرح حکمۃ الاشراق، شرح مسلم الثبوت، بحر العلوم، کتاب المستصفی، کتاب اللمع۔

مشرقی لٹریچر اور سرکاری وسائل علم

یہ کہنا ضروری نہیں کہ میں اپنے ڈیفنس کی غرض سے ان شہادتوں کی بے اعتمادی ثابت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو پورا پورا اقرار کر چکا ہوں مقصود صرف دو باتوں کا اظہار ہے۔

اولاً جو سرکاری مقدمات اردو تحریر و تقریر کی بنا پر چلائے جاتے ہیں، ان کے وسائل ثبوت کس درجہ ناکارہ اور ناقابل اعتماد ہیں؟

ثانیاً: ہندوستان کی بیورو کریسی کی ناکامیابی اور ناموافقت، وہ ڈیڑھ سو برس تک حکومت کرکے بھی اس قابل نہیں ہوئی، کہ ہندستانی زبانوں کے متعلق صحیح اور مستند ذرائع سے معلومات حاصل کر سکتی۔

مجھے یاد ہے کہ جب اکتوبر ۱۹۱۶ء میں نظربند کیا گیا اور بہار گورنمنٹ کے حکام اور پولیس افسر (جن کو اردو زبان سے بمقابلہ بنگال زیادہ تعلق ہے) تلاشی کے لیے آئے تو انہوں نے میری تمام کتابوں کو بھی ایک خوفناک لٹریچر سمجھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ قبضہ میں کر لیا۔ یہ تمام کتابیں عربی اور فارسی زبان میں تھیں اور تاریخ، فقہ، فلسفہ کا معمولی مطبوعہ ذخیرہ تھا۔ جو بازاروں میں فروخت ہوتا رہتا ہے۔ صرف ایک کتاب "مطالب عالیہ" نامی قلمی تھی۔ جو سب سے زیادہ پُراسرار سمجھی گئی۔ لطف یہ ہے کہ ان کی فہرست ڈپٹی کمشنر کی درخواست سے مجھے ہی مرتب کرنی پڑی۔ کیونکہ تفتیش جرائم کے اس پورے کمیشن میں ایک شخص بھی اس قابل نہ تھا۔

یہ قدرتی کمزوری افراد اور جماعت دونوں میں یکساں طور پر نمود رکھتی ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنے قبضہ میں آئی ہوئی چیز صرف اس لیے لوٹا دیں گے کہ وہ اس کے حق دار نہیں! پھر ایک پورے برِ اعظم کے لیے ایسی امید کیوں کر کی جا سکتی ہے؟ طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلّل ہے۔ وہ خود طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ نمودار ہو جاتی ہے تو پھر نا واجب سے نا واجب مطالبہ کے آگے بھی جھک جاتی ہے پس کش مکش اور انتظار ناگزیر ہے اور ایک ایسی قدرتی بات ہے جس کو بالکل دنیا کے معمولی کاموں کی طرح بلا کسی تعجب اور شکایت کے انجام پانا چاہیے۔

میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ تاریخ نے اس بارے میں انسانی ظلم و تعدّی کے جو ہیبت ناک مناظر دکھلائے ہیں، ان کے مقابلے میں موجودہ جبر و تشدد کسی طرح بھی زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کمی اس لیے ہے کہ ظلم زیادہ مکمل نہیں ہے؟ مستقبل اس کو واضح کر دے گا۔

جس طرح اس کش مکش کا آغاز ہمیشہ یکساں طور پر ہوا ہے اسی طرح خاتمہ بھی ایک ہی طرح ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہمارا جذبۂ آزادی و حق طلبی سچا اور اٹل ثابت ہوا۔ تو یہی گورنمنٹ جو آج ہمیں مجرم ٹھہرا رہی ہے کل کو فتح مند محب الوطنوں کی طرح ہمارے استقبال پر مجبور ہو گی۔

اصل یہ ہے کہ کسی جرم کے لیے جو لٹریچر سے تعلق رکھتا ہو، کوئی ایسی عدالت منصفانہ کارروائی نہیں کر سکتی جو ذاتی طور پر رائے قائم نہ کر سکے۔ یعنی خود اس بات سے واقف نہ ہو لیکن موجودہ بیوروکریسی علاوہ بیوروکریسی ہونے کے غیر ملکی بھی ہے۔ اس لیے ہر گوشہ میں اجنبی اقتدار کی غلامی کے نتائج کام کر رہے ہیں۔ عدالتیں ہندوستان کی ہیں اور ہندوستانیوں کے لیے ہیں۔ لیکن ان کی زبان جزیرۂ برطانیہ کی ہے اور اکثر حالتوں میں ایسے افراد سے مرکب ہیں۔ جو ملکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے کہ اب ہم اس گورنمنٹ سے اور کچھ نہیں چاہتے صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو وہ اپنے سے بہتر اقتدار کے لیے اپنی جگہ خالی کر دے۔

موجودہ حالت قدرتی ہے

۱۸۔ میں جیسا کہ ابتدا میں لکھ چکا ہوں۔ خاتمۂ سخن میں بھی دہراؤں گا آج گورنمنٹ جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہی ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کے لیے خاص طور پر اسے ملامت کی جائے۔ قومی بیداری کے مقابلے میں مقاومت اور جبر و تشدد تمام قابض حکومتوں کے لیے طبیعت ثانیہ (سیکنڈ نیچر) کا حکم رکھتا ہے اور ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ ہماری خاطر انسانی طبیعت بدل دی جائے گی۔

ہے۔ آخری فتح اسی عمل کی ہوتی ہے جو حق سچ ہو اور اس لیے باقی و قائم رہنے کا حق دار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہوگا تو آخر کی جیت انصاف ہی کے حصہ میں آئے گی۔

وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ

زمین پر وہی چیز باقی رہے گی جو نافع ہو۔ غیر نافع چھانٹ دی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں سچائی کا نام "حق" ہے جس کے معنی ہی جم جانے اور ثابت ہو جانے کے ہیں اور جھوٹ اور بدی کا نام باطل ہے، جس کے معنے ہی مٹ جانے کے ہیں۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ؕ

باطل تو صرف اس لیے ہے کہ مٹ جائے۔

پس آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ انصاف باقی رہے گا۔ ناانصافی مٹا دی جائے گی ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

البتہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھ کر بارش کا انتظار کیا جائے ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں افسوس ان آنکھوں پر جو نشانیوں سے انکار کریں۔

میں نے انہی تقریروں میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں کہا تھا "آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی

بغاوت

۱۹۔ مجھ پر سڈیشن کا الزام عاید کیا گیا ہے لیکن مجھے "بغاوت" کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا "بغاوت" آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابلِ احترام حُبّ الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلّح لیڈر باغی تھے لیکن آج ڈی ویلرا اور گریفتھ کے لیے برطانیہ عظمیٰ کونسا لقب تجویز کرتی ہے۔

اسی آئرلینڈ کے پارنل (PARNAL) نے ایک مرتبہ کہا تھا: "ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حُبّ الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کرتا ہے۔

قانون "قضاء بالحق"

۲۰۔ میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لیے وہ بس کرتا ہے جو میری کتاب شریعت نے بتلایا ہے۔ قرآن کہتا ہے: جس طرح مادہ اور اجسام میں انتخاب طبیعی NATARAL SELECTIO اور بقاء اصلح SURORVIIAL OF THE FITTEST کا قانون جاری ہے اور فطرت صرف اسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح و اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد اور اعمال میں بھی قانون کام کر رہا

انہوں نے اس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاہر کیا ہے کوئی بات بھی غلط نہیں کہی ہے۔

میری تقریریں جو پیش کی گئی ہیں ان میں بھی کوئی بات شرارت کی نہیں پاتا۔ جس قدر ان کے اغلاط اور نقائص ہیں، صرف ناقابلیت کا نتیجہ ہیں۔ ایک دو مقامات ایسے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جا سکتا ہے کہ دانستہ خراب کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً جہاں جہاں میں نے لوگوں کو با امن رہنے، ہڑتال نہ کرنے، ہر طرح کے مظاہرات سے مجتنب رہنے کی تلقین کی ہے۔ وہ بقیہ حصوں سے بھی زیادہ الجھے ہوئے اور بے ربط ہیں۔ متعدد مقامات پر "امن" کو "ایمان" کر دیا ہے جو بالکل بے ربط ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی قاعدہ کے نقائص اور ذاتی ناقابلیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شرارت سے۔

البتہ میرا یقین ہے کہ انہوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے وہ ضرور معصیت ہے لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی کمزوری بھی معلوم ہے۔ وہ محض چند روپیہ کی نوکری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں پس میرے دل میں ان کے لیے رنج و ملامت نہیں ہے۔ میں اس کام کے لیے انہیں معاف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی معاف کر دے۔

پبلک پراسیکیوٹر بھی جو ان مقدمات میں کام کر رہا ہے۔ میرا ایک

سے اس کی آبیاری نہ ہو۔"

لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے۔

بلس نے اپنی تقریروں میں کہا تھا: "مبلغین کی گرفتاری پر مغموم کیوں ہو! اگر تم فی الحقیقت انصاف اور آزادی کے طلب گار ہو تو جیل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ علی پور کا جیل اس طرح بھر جائے کہ اس کی کوٹھڑیوں میں چوہوں کے لیے جگہ باقی نہ رہے۔"

فی الحقیقت جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ پریذیڈنسی اور سنٹرل جیل کا بڑا حصہ معمولی قیدیوں سے خالی کر دیا گیا۔ پھر بھی جگہ کافی نہ ہوئی۔ نیا جیل بنایا گیا وہ بھی آناً فاناً بھر گیا۔ جگہ نکالنے کے لیے سینکڑوں قیدی رہا کر دیے گئے لیکن ان سے دوگنے نئے آ گئے۔ اب مزید نئے جیل بنائے جا رہے ہیں۔

سرکاری وکیل، پولیس اور مجسٹریٹ

۲۱۔ قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کروں، اپنے ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی ایک دو جملے کہوں گا جو اس مقدمہ میں میرے خلاف کام کر رہے ہیں۔ میں نے اوپر کہیں کہا ہے کہ سی آئی ڈی کا کام جہالت اور شرارت دونوں سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ میں نے اس ذاتی علم کی بنا پر کہا ہے جو بے شمار مقدمات کی نسبت مجھے حاصل ہے۔ تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی آئی ڈی کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ہے۔

کو نہ ہو گا۔"

خاتمہ

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا ہے۔ تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کریں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَّآخِراً ط

۱۱ جنوری ۲۲ ۱۹ء

پریذیڈنسی جیل۔ علی پور، کلکتہ

(احمد)

ہم وطن بھائی ہے۔اس کی ضمیر یا رائے میرے سامنے نہیں ہے۔
محض مزدوری ہے جو اس کام کے لیے گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے
پس اس کی طرف سے بھی میرے دل میں کوئی رنج نہیں۔ البتہ میں ان
سب کے لیے وہی دعا مانگوں گا جو پیغمبر اسلام نے ایک موقع پر
مانگی تھی :-

"خدایا! ان پر راہ کھول دے، کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر
رہے ہیں۔"

فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔زیادہ سے زیادہ سزا
جو اس کے اختیار میں ہے، بلا تامل مجھے دے دے۔ مجھے شکایت
یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے،
کسی ایک پرزے سے نہیں ہے۔میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین
نہیں بدلے گی، پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیلِ صداقت "گارڈینیو برونو" کے لفظوں
پر ختم کرتا ہوں۔جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔
"زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جاسکتی ہے' بلا تامل دے دو۔
میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے
دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل

میں کام کرنے والوں کو ہڑتال کے ارادے سے نہیں روکا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی۔، کو جب مولانا کو معلوم ہوا تو انہوں نے فوراً رکوا دیا اور ہر جگہ یہ بات پہنچا دی گئی کہ جو شخص ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کے اظہارِ محبت و عقیدت کی صرف یہی راہ ہے کہ والنٹیر بن جائے اور جیل جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہڑتال اور مظاہرہ نہ صرف اصول کے خلاف ہے بلکہ مقاصد کے لیے مُضر بھی ہے۔

اگرچہ یہ تمام کاروائیاں علانیہ ہو رہی تھیں۔ افسرانِ جیل کی موجودگی میں وہ تمام پیغامات دیتے تھے اور لکھواتے تھے اور پھر اخبارات میں بھی شائع ہو جاتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ارکانِ حکومت کو اطمینان نہ تھا۔ مولانا اور مسٹر داس کے مقدمات میں عدالت کی جانب سے پئے در پئے التواء کیا گیا۔ گورنمنٹ کا تذبذب اور اضطراب بھی برابر ظاہر ہوتا رہا۔ نیز راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تجویز اور نام نہاد مصالحت کی کاروائیاں بھی جاری رہیں۔ ان تمام اسباب سے پبلک کو یہ توقع ہو گئی تھی کہ شاید انہیں رہا کر دیا جائے۔ زیادہ تائید اس بات کی کلکتہ اور بنگال کی مخصوص حالت سے بھی ہوتی تھی جس کی طرف سے مقامی گورنمنٹ کی تشویش روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور بار بار یہ افواہیں مشہور کی جاتی تھیں کہ بہت جلد ان کو رہا کر دیا جائیگا۔ گورنمنٹ کو بڑی تشویش مزدوروں کی ہڑتال سے تھی۔ علی الخصوص خضر پور ڈک کے مزدوروں اور شہر کے تمام خانساموں وغیرہ سے جو پندرہ بیس ہزار کی تعداد میں ہوٹلوں اور انگریزوں کے پرائیویٹ مکانوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کا ایک دن کے لیے بھی ہڑتال کرنا تمام انگریز آبادی کی

آخری پیشی

۹ رفروری سے پہلے مولانا کی جانب سے حسب ذیل امور کا زبانی اور بذریعہ اخبار اعلان کیا گیا :۔

۱۔ ۹ رفروری کو کوئی شخص عدالت کی کارروائی دیکھنے نہ آئے نہ ہی کسی طرح کا ہجوم سڑکوں پر ہو۔

۲۔ یہ یقینی ہے کہ انہیں سزا کا حکم سنایا جائے گا۔ پبلک کو چاہیئے کہ پورے صبر و سکون کے ساتھ اس کی منتظر اور متوقع رہے۔ کوئی ہڑتال نہیں ہونی چاہیئے۔ نہ کسی طرح کا غیر معمولی مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

۳۔ ۹ رکو لوگ جیل کی طرف بھی ہجوم نہ کریں اور نہ انہیں دیکھنے کے لیے جدوجہد کریں۔ صرف اپنی معمولی روزانہ جدوجہد جاری رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو اس کی سرگرمی بڑھائیں۔

بعض کارکنانِ خلافت و کانگریس نے غلطی سے کارخانوں اور سرکاری محکموں

نے بھی کام چھوڑا۔"

اس پیغام نے نہایت تعجب انگیز اثر پیدا کیا۔ جس کی خود گورنمنٹ کو بھی توقع نہ تھی۔ تمام لوگ جو جوش و اضطراب میں بے قابو ہو رہے تھے، پتھر کی طرح اپنی اپنی جگہ جم گئے۔ ہڑتال کا ارادہ بالکل فسخ کر دیا گیا۔ اور ۹ کو عدالت اور جیل میں بھی کسی طرح کا ہجوم نہیں ہوا۔

بایں ہمہ گورنمنٹ کے ارکان مطمئن نہ تھے اور دیکھ رہے تھے کہ گیارہ بجے کے بعد کیا صورت پیش آتی ہے؟ اس لیے گیارہ بجے تک جیل میں کوئی خبر نہیں دی گئی کہ کاروائی کہاں ہو گی؟ کورٹ میں یا جیل میں؟ جب گیارہ بج چکے اور کسی طرح کی بھیڑ عدالت میں نہیں ہوئی، مولانا طلب کیے گئے، بارہ بجے وہ پہنچے۔ اس وقت ایک مقدمہ کی کاروائی ہو رہی تھی لیکن مجسٹریٹ نے عارضی طور پر اسے ملتوی کر کے مولانا کو طلب کیا اور فیصلہ سنایا۔ فیصلہ یہ تھا۔ کہ ایک برس قید بامشقت۔

مولانا نے فیصلہ سن کر مجسٹریٹ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ تو اس سے بھی بہت کم ہے جس کی مجھے توقع تھی! مجسٹریٹ ہنسنے لگا اور مولانا برآمدے میں واپس آ گئے۔

یہاں کورٹ انسپکٹر موجود تھا جو انہیں اپنے آفس روم میں لے گیا اور کہا:۔ مجھے آپ معاف فرمائیں گے اگر میں چند منٹ آپ کو یہاں بٹھاؤں اور ضابطہ کی کارروائی انجام دے دوں۔ مولانا نے کہا: میں یہ "چند منٹ" ایک سال قید بامشقت میں شمار نہیں کروں گا۔ یہاں اس نے سزا کے رجسٹر میں حسب قاعدہ ان کا نام ولدیت

زندگی دشوار کر سکتا ہے۔ اسی طرح ڈک کے مزدوروں کی جماعت بھی ایک ایسی جماعت ہے جو اگر کام چھوڑ دے تو اس کا کام ایک دن کے لیے بھی دوسرے آدمی نہیں چلا سکتے۔ تمام تجارت اور مال کی درآمد برآمد اسی پر موقوف ہے۔

خانساموں اور ڈک کے مزدوروں کی باقاعدہ یونین قائم ہے۔ دونوں نے فی الواقع ہڑتال کا ارادہ کر لیا تھا۔ ڈک کے مزدور تو ان کی گرفتاری پر ہڑتال کر بھی چکے تھے۔ لیکن کانگریس کمیٹی نے بمشکل سمجھا بجھا کے کام پر لگایا۔

اسی طرح تمام سرکاری کالجوں کے طلباء کی نسبت بھی گورنمنٹ کا یہی خیال تھا کہ بمجرد اعلان سزا کے کالجوں سے نکل آئیں گے۔ انہی اسباب سے فیصلہ میں تاخیر کی جا رہی تھی۔

لیکن مولانا نے، کو ایک پیغام تمام اخبارات میں اس مضمون کا شائع کرایا۔ کہ ان کے مقدمہ کی نسبت کوئی غلط توقع لوگ نہ باندھ لیں۔ یہ قطعی ہے کہ انہیں سزا دی جائے گی۔ لوگوں کو چاہیئے کہ پورے نظم و سکون کے ساتھ اس کے سننے کے لیے تیار رہیں۔ ہڑتال وغیرہ کے لیے انہوں نے کہا:

"ہم ایک سال سے کہتے آئے ہیں کہ کامیابی اسی پر موقوف ہے کہ خاموشی کے ساتھ لوگ گرفتار ہو جائیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے اپنے تئیں گرفتار کرا دیا۔ اب جب ہم خود گرفتار ہوئے ہیں تو ہمیں بھی اپنے لیے وہی پسند کرنا چاہیئے جو ہم نے دوسروں کے لیے پسند کیا تھا۔ یہ نہایت افسوس ناک غلطی ہو گی، اگر ہماری سزایابی کے لیے ہڑتالیں کی گئیں، یا ہمیں چھوڑ دینے کے لیے کسی ایک ہندوستانی

فیصلۂ عدالت

مقدمہ نمبری ۲۸ - سنہ ۱۹۲۲ء

قیصرِ ہند

بنام

محی الدین احمد عرف مولانا ابوالکلام آزاد

عمر، حلیہ، قد اور دستخط کا اندراج کر لیا۔ اس کے بعد وہ جیل کی گاڑی میں مسلح پولیس کے ساتھ روانہ کر دیے گئے۔

اس طرح کامل ساٹھ دن کے بعد یہ کہانی ختم ہو گئی اور جس شخص کو ایک دن کے لیے بھی قید کرنا گورنمنٹ کے لیے آسان نہ تھا اور بغیر اس کے ممکن نہ تھا۔ کہ لاکھوں انسانوں کے اضطراب پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ وہ اس آسانی اور خاموشی کے ساتھ ایک سال کے لیے قید خانے بھیج دیا گیا۔ یہ فی الحقیقت نون کوآپریشن کے نظم و طاقت کا ایک حیرت انگیز ثبوت ہے۔

عدالت کا فیصلہ (جیسا کہ توقع تھی) نہایت مختصر ہے۔ نہ تو استغاثہ کی تشریح کی گئی ہے، نہ الزام کے اثبات کے وجوہ و دلائل بیان کیے ہیں۔ حتّٰی کہ یہ بات بھی اس سے معلوم نہیں ہو سکتی، کہ ملزم نے کن الفاظ کے ذریعہ ۱۲۴۔الف کا ارتکاب کیا ہے؟ اور کیوں کر اس کی تقریریں اس دفعہ کے ماتحت آتی ہیں؟ البتہ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ملزم نے تقریروں کے تمام وہ حصے تسلیم کر لیے، جو گورنمنٹ کے متعلق تھے، مگر وہ کیا ہیں؟ ان پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ بہتر یہ تھا کہ سزا کی بنیاد اسی بات پر رکھ دی جاتی۔ کہ ملزم نے نہایت صفائی کے ساتھ اپنے "مجرم" ہونے کا بار بار اظہار کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ بحالتِ موجودہ آزادی اور حق کا مطالبہ ہی جرم ہے۔

کے نوٹ لینے کے لیے متعین کیا۔

افسران مذکور جلسہ میں شریک ہوئے، انہوں نے تمام کاروائی اور تقریروں کے نوٹ لیے۔ ان میں ملزم کی تقریر بھی ہے جو اس جلسہ کے صدر تھے، جلسہ میں تقریباً بارہ ہزار آدمیوں کا اجتماع تھا جلسہ کا مقصد خلافت کے تین مبلّغ سعید الرحمٰن، اجودھیا پرشاد اور جگدمبا پرشاد کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا۔

منجملہ اور مقرروں کے ملزم نے بھی اردو میں ایک طویل تقریر کی۔ ان کی تقریروں کے نوٹ اردو شارٹ ہینڈ رپورٹر ابواللیث محمد نے اور کچھ حصے دوسرے پولیس کے افسروں نے لیے۔ یہ نوٹ مسٹر گولڈی کے سامنے پیش ہوئے۔ انہوں نے ان پر دستخط ثبت کر دیے۔

ابواللیث نے اپنا نوٹ صاف کر کے اس کی نقل مسٹر گولڈی کے پاس بھیج دی۔ دوسرے پولیس افسروں نے بھی اپنے اسی لانگ ہینڈ نوٹ کی ایک مشترکہ رپورٹ افسر مذکور کے پاس بھیج دی تھی۔

۱۵ر جولائی ۲۱ء کو مسٹر گولڈی نے اسی اردو شارٹ ہینڈ رپورٹر، ابواللیث محمد، انسپکٹر بی، بی مکرجی، سب انسپکٹر محمد اسمٰعیل اور ایس کر کو ایک دوسرے جلسہ کی کاروائیوں اور تقریروں کے نوٹ لینے کے لیے متعین کیا جو اسی مقام پر ہونے والا تھا۔

ملزم حاضرین جلسہ تھے۔ انہوں نے مذکورہ بالا خلافت کے

اس مقدمہ میں مولانا ابوالکلام آزاد زیر دفعہ ۱۲۴-الف تعزیرات ہند مجرم قرار دیے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے پہلی جولائی ۱۹۲۱ء کو اسی مقام پر مسئلہ ترکِ موالات وغیرہ پر اردو میں تقریر کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کیے جن کے ذریعہ گورنمنٹ قائم شدہ بروئے قانون کے خلاف لوگوں میں نفرت و حقارت پھیلانے کی کوشش کی۔

استغاثہ کی طرف سے جو شہادتیں پیش ہوئی ہیں، ان سے حسب ذیل واقعات ثابت ہوتے ہیں:-

مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر پولیس اسپیشل برانچ نے یہ اطلاع پاتے ہی کہ یکم جولائی کو مرزاپور پارک میں کوئی جلسہ ہونے والا ہے، اپنے اردو شارٹ ہینڈ رپورٹر ابواللیث محمد، انسپکٹر ایس، کے گھوسال، سب انسپکٹر محمد اسمٰعیل اور ایس، سی کر کو جلسہ کی کارروائی اور تقریروں

جو ترجمہ اس نے کیا ہے وہ صحیح اور اصلی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ میں ان کی سچائی میں شک کروں۔

ملزم نے ایک طویل بیان داخل کیا ہے، جو گورنمنٹ کی برائیوں کی داستان سے پُر ہے۔ اس میں نہایت تشریح کے ساتھ ان تمام کارروائیوں کو دکھایا ہے جن کی وجہ سے وہ گورنمنٹ کو "ظالم گورنمنٹ" کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور نیز اپنی تمام کارروائیوں کا ذکر کیا ہے جو ان غیر قانونی کارروائیوں کے خلاف اس نے کی ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی تقریروں کی نقل بالکل ناقص، غلط اور مسخ شدہ ہے اور محض بے جوڑ اور بعض مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے لیکن بہرکیف وہ ان تمام حصوں کو تسلیم کرتا ہے جن میں گورنمنٹ کی نسبت خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یا پبلک سے گورنمنٹ کے خلاف جدوجہد کی اپیل کی گئی ہے۔

میں نے نہایت احتیاط سے یہ تقریریں پڑھی ہیں اور ان پر کامل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ باغیانہ ہیں۔

اور یہ کہ ملزم نے ان تقریروں کے ذریعہ گورنمنٹ قائم شدہ از روئے قانون کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے کی کوشش کی۔

میں ملزم کو حسب دعویٰ استغاثہ مجرم پاتا ہوں اور زیر دفعہ ۱۲۴۔ الف تعزیراتِ ہند ایک سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔

۹ فروری سنہ ۱۹۲۲ء (دستخط) ڈی سوینہو چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ۔ کلکتہ

تین مبلغین :-

سعید الرحمٰن، جگدمبا پرشاد اور اجودھیا پرشاد

کی سزایابی کے خلاف اردو میں تقریر کی اور لوگوں کو اس بات کی تلقین کی اور شوق دلایا۔ کہ وہ بھی ان کی پیروی کریں اور جیل جائیں جلسہ میں دس ہزار کا مجمع تھا۔ ابواللیث نے ملزم کی تقریر کے نوٹ اردو شارٹ ہینڈ میں لیے اور دوسرے افسروں نے ان کے کچھ حصے لانگ ہینڈ میں لیے۔

ابواللیث محمد نے اپنا نوٹ صاف کر کے اس کی نقل اور دوسرے افسروں نے ایک مشترک رپورٹ مسٹر گولڈی کے سامنے پیش کر دی۔

ابواللیث کے و کی دونوں نقلوں کا ترجمہ سرکاری مترجم مسٹر باما چرن چیٹر جی نے کیا ہے۔ مسٹر گولڈی نے نقل اور ترجمہ ملنے کے بعد ملزم کی مذکورہ تقریروں کے خلاف ۱۲۴۔ الف کے ماتحت گرفتار کرنے کی درخواست گورنمنٹ آف بنگال سے کی اور ۲۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو سینکشن حاصل کیا۔

اس نے اس سینکشن کی تصدیق بھی کر دی ہے۔

ابواللیث و سکر افسروں نے حلفیہ بیان کیا کہ جو نوٹ انہوں نے لیے ہیں اور جو مشترکہ رپورٹ انہوں نے داخل کی ہے وہ درست اور سچی ہیں۔

باما چرن چیٹرجی نے بھی حلفیہ بیان کیا ہے کہ دونوں نقلوں کا